اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

دعوتِ فکر

۱۴۴۴ھ

- مقصدِ حیات کی پہچان
- پورے اسلام میں داخل ہونا
- دین کے تمام شعبوں پر عمل
- نفس اور خواہشات پر قابو پانا
- زندگی گزارنے کے طریقے
- تقویٰ اور اس کے تقاضے
- دل و اعمال کی اصلاح
- مسلمان کی اصل کامیابی
- گناہوں سے اجتناب
- دین سیکھنے کا اہتمام

مولانا نظام الدین شانگلوی

فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

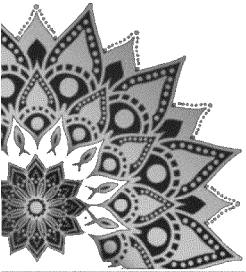

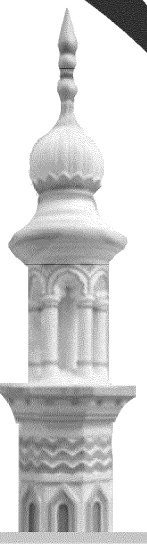

مجلس علم و ادب
شانگلہ

﴿جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں﴾

☆☆☆

نام کتاب: ـــــــــــــــــــ دعوت فکر

مصنف: ـــــــــــــــــــ مولانا نظام الدین

سنہ تصنیف: ـــــــــــــــــــ مئی ۲۰۲۱ء

کمپوزنگ: ـــــــــــــــــــ حسام کمپوزنگ سنٹر شانگلہ

ڈیزائننگ: ـــــــــــــــــــ یسریٰ گرافکس

ناشر: ـــــــــــــــــــ مجلس علم وادب شانگلہ

رابطہ نمبر: ـــــــــــــــــــ 0333-8628280

ملنے کے پتے: ـــــــــــــــــــ

فہرست مضامین وعنوانات

عرضِ مؤلف ۶

انسان کی پیدائش کا مقصد ۸

عبادت ۹

اسلام کا مفہوم ۹

صرف ایمان لانا کافی نہیں ۱۰

اللہ تعالیٰ کا مطالبہ (پورے دین پر عمل کرنا) ۱۲

دین کے شعبے ۱۳

☆ شعبۂ عقائد/ایمانیات ۱۳

☆ شعبۂ عبادات ۱۴

☆ شعبۂ معاملات وسیاسیات ۱۵

☆ شعبۂ معاشرت وآداب ۱۵

☆ شعبۂ اخلاق واصلاحِ نفس ۱۶

تبصرہ ۱۷

اعمال اور دل کی اصلاح ۱۸

صرف چند عبادات کو دین سمجھنا ۲۰

دین کے مطابق زندگی گزارنا مشکل کام ہے ۲۱

حقوق اللہ اور حقوق العباد ۲۳

دین سیکھنا ہر ایک کی اپنی ذمہ داری ہے ۲۷

کتنا علم سیکھنا فرض ہے؟ ۲۹
علم، عمل اور اخلاص ۳۱
زندگی عارضی ہے ۳۳
نصیحت کے چند جملے ۳۷
دنیا پرستی اور مال و دولت جمع کرنا ۳۸
دنیاوی اسباب اختیار کرنا ۴۲
جدید تعلیم اور اسباب کی ضرورت واہمیت ۴۶
تقویٰ اور اس کے تقاضے ۵۰
گناہ کب ہوتا ہے! ۵۷
اصل ذکر کیا ہے؟ ۵۸
اعلانیہ گناہ کرنا ۵۹
گناہوں سے توبہ اور اس کا طریقہ ۶۱
☆ توبہ کا طریقہ ۶۳
نیکی کے مقابلے میں گناہوں سے بچنے کا اہتمام ۶۶
اصل امتحان (نفس اور خواہشات کا مقابلہ) ۶۸
خود حسابی اور نفس کا علاج ۷۱
کامیاب اور ہوشیار کون ہے؟ ۷۴
دین کے لیے فکرمندی اور جستجو ۷۹
دین کے لیے عقل و فکر کا فقدان ۸۱
دین اور دینی کاموں کے لیے وقت نہ ہونا ۸۳

شیطان کا دھوکہ ۸۶
فخر، مبارکباد اور تعریف کا معیار ۹۰
نیکی میں تعاون اور حق کا ساتھ دینا ۹۴
علماء کرام اور نیک لوگوں کی قدر وعزت ۹۷
عوام کی ذمہ داریاں ۱۰۱
☆ دین سیکھنے کا اہتمام ۱۰۲
☆ زندگی بدلنے کا عزم ۱۰۲
☆ دین سے جڑے رہنا ۱۰۳
☆ کسی نیک آدمی سے تعلق ۱۰۴
☆ دینی محافل میں شرکت ۱۰۴
☆ نیک صحبت اختیار کرنا ۱۰۶
نئی نسل کی دین سے دوری ۱۰۹
فکری اور نظریاتی گمراہی ۱۱۴
والدین کی ذمہ داری ۱۱۷
مسلمانوں کے اجتماعی فرائض ۱۲۰
☆ دعوتِ دین واشاعتِ دین ۱۲۰
☆ اسلامی معاشرہ کی تشکیل ۱۲۳
فتنے اور علامات قیامت ۱۲۵

عرضِ مؤلف

زیرِنظر کتاب کے اندر خالص واعظانہ اور اصلاحی انداز میں مقصدِ حیات کی پہچان، دین کی طرف رغبت پیدا کرنے، گناہوں سے اجتناب، اصلاحِ نفس اور زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت کے احکام کی رعایت کے لیے فکرمندی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں احکامات اور مسائل کا ذکر نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنے کی دعوت ہے۔ چونکہ یہ کوئی فنی یا تحقیقی کتاب نہیں، اس لیے اصل مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے تحریر کے دوران ممکن حد تک مشکل الفاظ اور علمی اصطلاحات کے استعمال نیز جملوں میں بے جا پیچیدگیاں پیدا کرنے اور ان پر ادبی رنگ چڑھانے سے اجتناب کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب اور مضامین کی ترتیب میں بعض تکنیکی امور کا لحاظ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اس سادہ اور عام فہم انداز کو اپنانے سے غرض یہ ہے کہ ہر وہ شخص اس کتاب کے مضامین سے بڑی آسانی کے ساتھ بغیر کسی تکلیف کے نفع حاصل کرے جو صرف اردو زبان پڑھ سکتا ہو اور اس (کتاب) کا مطالعہ صرف زیادہ تعلیم یافتہ یا مشکل و ادبی کتابیں پڑھنے والے افراد تک محدود نہ رہے۔ ہر مضمون کے تحت لمبی لمبی تفصیلات اور عنوانات یا مسائل و احکامات کے بجائے مختصر انداز میں متعلقہ موضوع کی طرف صرف توجہ دلائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان صفحات کو لکھنے کے لیے کوئی بڑا اہتمام بھی نہیں کیا گیا ہے بلکہ گذشتہ مہینے بیماری کے باعث میں چند ہفتے بستر پر رہا، گویا اللہ تعالیٰ نے باہر کی مصروفیات سے زبردستی نجات دلا کر مجھے گھر ہی میں پابند کرنا منظور فرمایا۔ اس بیماری کے دوران جب طبیعت تھوڑی سنبھل جاتی تو قلم اور کاغذ اٹھا کر دو تین صفحات لکھ دیتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بیس دنوں کے اندر اندر چند موضوعات پر اپنے علم و استطاعت کے مطابق یہ مختصر سا مجموعہ تیار کیا، جس کو آپ کسی اہتمام و

انتظام کے تحت لکھنے والی کتاب نہیں بلکہ سادہ الفاظ پر مشتمل ''دردِ دل'' کا اظہار سمجھ لیں۔ قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور شرعی احکام ومسائل پر سینکڑوں ہزاروں کتابیں موجود ہیں، جن سے مدارس اور باہر کے وہ لوگ بھرپور فائدہ اٹھا رہے ہیں جو پہلے سے دین کی طرف رغبت وتوجہ رکھتے ہیں۔ چونکہ عصر حاضر میں بہت زیادہ مادیت اور دنیا پرستی کے باعث عوام کے دلوں میں دین کی ضرورت واہمیت کم ہورہی ہے، اور پوری توجہ دنیا ہی کی زندگی پر ہے، اس لیے میں نے اپنی پہلی کتابی کاوش میں زیرِنظر موضوع کا انتخاب کیا اور کتاب کا نام بھی ''دعوت فکر'' رکھا، تاکہ لوگوں کے دلوں میں دین کی فکر پیدا کی جائے، جس کے بعد وہ خود بخود علماء کرام کی طرف رجوع کرکے احکام ومسائل سیکھنے کی کوشش کریں گے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول فرما کر عام مسلمانوں کے لیے نافع اور میرے لیے باعث اجر وثواب بنادے۔

(نظام الدین)

مئی: ۲۰۲۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْن وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلامُ عَلىٰ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ، وَ بَعْدُ!

انسان کی پیدائش کا مقصد

تمام مخلوقات میں انسان اور جنات اس لحاظ سے الگ اور ممتاز ہیں کہ اللہ تعالی نے خود ان کی پیدائش کی وجہ واضح کر کے ان کے لیے زندگی کا مقصد متعین فرما دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْن ﴾ (میں نے جنات اور انسانوں کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔) (الذاریات:٥٦)

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پیدائش اور اس دنیا میں زندگی گزارنے کا واحد مقصد صرف اللہ کی عبادت ہے۔ یہاں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرے گا جس میں انسان کسی بھی طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل رہے یا وہ کوئی کام حکمِ خداوندی کی روشنی سے ہٹ کر کرے۔ غور کیا جائے تو جہاں یہ ایک طرف انسان کے لیے بہت بڑا امتحان اور پابندی ہے تو دوسری طرف باعث افتخار بھی ہے کہ اتنی ساری مخلوقات میں سے اللہ نے اسے اپنے قرب اور عبادت کے لیے چن لیا ہے، اور پھر اس کو ''اشرف المخلوقات'' کے اعزاز سے بھی نوازا ہے۔ عقل جیسی عظیم نعمت سے مالا مال اس اشرف المخلوقات (انسان) کی عظمت اور رتبہ تب قائم ہوگا جب وہ اپنی زندگی کا اولین مقصد پہچان کر اپنے آپ کو دیگر مخلوقات سے واقعی ممتاز بنالے۔ اس لحاظ سے دنیا میں رہتے ہوئے ہر عمل کے دوران یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ عمل میری زندگی کے اصل مقصد کے موافق ہے یا مخالف!۔۔ اور اس عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہوگا یا ناراض!۔۔ اور یہی عبادت کا بنیادی تقاضا ہے۔

عبادت

عبادت یعنی بندگی کا لغوی مفہوم و مطلب ہے کسی کے سامنے انتہائی عاجزی اور ذلت و انکساری دکھانا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی میں مطلوب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو واقعی بندہ اور غلام سمجھے اور اللہ تعالیٰ کو سب کچھ کا مالک مان کر اس کے احکامات اور شان بڑائی کے سامنے اپنی کمتری و بے بسی کو تسلیم کر لے۔ یہ بندہ جب اپنے رب کی بندگی اور غلامی کا حق ادا کرتے ہوئے اُس کے احکامات کی تعمیل کرتا ہے تو اس عمل کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت دراصل اپنے ایمان اور اللہ تعالیٰ کو رب ماننے کا عملی اظہار ہے جو ایک مسلمان اسلام کی شکل میں سامنے لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پابند بناتے ہوئے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے، انسان کے ذمہ اُن کو بجالانا ہے اور جن کاموں سے منع کیا ہے، اُن سے رُک جانا ہے۔ عبادت کا تقاضا ہے کہ انسان کسی دوسرے کی حاکمیت تسلیم نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے علاوہ کسی اور قانون کو ماننے سے نہ صرف زبانی بلکہ عملی انکار بھی کرے۔ نماز کی ہر رکعت میں ہم ''ایاک نعبد'' کہہ کر زبان سے تو اعلان کرتے ہیں کہ ''اے اللہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں'' لیکن پھر اپنی عملی زندگی میں سراسر اس کے خلاف عمل کر رہے ہیں، ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو رب اور عبادت کے لائق ماننے کے بعد انسان کسی اور طرف دیکھے اور احکامات الٰہی سے روگردانی کرے۔

اسلام کا مفہوم

اللہ تعالیٰ کی بندگی قبول کرنے کے بعد جب بندہ عبادت کرتا ہے تو عبادت کے لیے جو احکامات اور طریقے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کے ذریعہ بھیجے گئے ہیں، اُن کا مجموعہ ''دین اسلام'' ہے اور جو بندہ اُن طریقوں اور احکامات کی پیروی کرتا ہے اُس کو مسلمان کہا جاتا ہے۔

اسلام کا لفظی معنی ہے ''سپرد'' یعنی حوالہ کرنا، تو اس مقام پر اسلام کا مفہوم و مطلب یہ بنے گا کہ انسان اپنے آپ کو مکمل طور اللہ تعالیٰ کے حوالے کرے، جس کے بعد وہ اپنی مرضی اور خواہش کا مالک نہ ہو بلکہ اس کے جملہ افعال و اطوار، خواہشات، معاملات اور زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق امور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہوں۔ گویا انسان اپنے نفس میں بے اختیار ہو کر اللہ تعالیٰ کی غلامی میں چلا جاتا ہے۔ ''اسلام'' دراصل اپنی ذاتی خواہشات اور مرضی کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا نام ہے کہ ہر جگہ آدمی اپنی خواہش اور مرضی کے مقابلے میں شریعت کے حکم کو دیکھ کر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ کو ان ظاہری اعمال سے کوئی غرض نہیں، یہ تو حقیقت میں ہمارے امتحان کے لیے ہیں کہ جب ہم نے اللہ تعالیٰ کو رب مانا اور اپنے آپ کو اسی کا بندہ تسلیم کر لیا تو اس دعویٰ کی تصدیق کے لیے احکامات اور اعمال کے ذریعے ہمارا جائزہ لیا جاتا ہے کہ ہم اپنے دعویٰ میں کس حد تک سچے ہیں۔

صرف ایمان لانا کافی نہیں

ایمان لا کر اسلام میں داخل ہونے کے بعد انسان کی نجات (خلاصی) کے لیے فقط یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر صرف ایمان لانے کو ہی سب کچھ سمجھے بلکہ یہ ایمان تب مفید ہوگا جب انسان ایمان کے ساتھ ساتھ اس کے جملہ تقاضوں کو بھی ملحوظِ نظر رکھے، کیونکہ اصل عبادت ایمان اور عمل کا مجموعہ ہے۔ اگر قرآنی آیات پر غور کیا جائے تو سینکڑوں مقامات پر جہاں ایمان کا تذکرہ ہے وہاں اس کے ساتھ متصل عمل صالح کا ذکر بھی موجود ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض اللہ تعالیٰ، رسول ﷺ، قرآن کریم، جنت، دوزخ، فرشتوں، تقدیر اور قبر کی حالت وغیرہ پر ایمان لانا اور ان کو حق سمجھنا کافی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تمام احکامات و ارشادات پر عمل کرنا بھی لازم و ضروری ہے۔ مشکوٰۃ شریف

میں بخاری کے حوالے سے ایک حدیث منقول ہے کہ:

وہب بن منبہ سے کہا گیا: کہ کیا ''لا الٰہ الا اللہ'' جنت کی چابی نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، لیکن ہر چابی کے دندانے ہوتے ہیں؛ اگر تم دندان والی چابی لاؤ گے تو یہ (جنت) آپ کے لیے کھلے گی، ورنہ نہیں کھلے گی۔ (مشکوٰۃ)

اس حدیث میں دندانوں سے مراد نیک اعمال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جنت جانے کے لیے صرف کلمہ پڑھنا کافی نہیں ہے بلکہ کلمہ کے ساتھ ساتھ اعمالِ صالحہ بھی ضروری ہیں۔ اسی طرح اس کے برعکس ایمان کے بغیر نیک اعمال بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔ کتنے غیر مسلم ایسے ہوتے ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اخلاقی و عملی لحاظ سے بھی وہ اعلیٰ رویوں اور کردار کے مالک ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ ایمان نہیں لائے، اسی لیے ان تمام اچھے افعال و اعمال کا اُن کو آخرت میں کچھ بھی فائدہ نہیں ملے گا اور باوجود اِن اچھے کاموں کے وہ جہنم میں جائیں گے۔۔۔ اسی طرح اگر ایک مسلمان کہلانے والا شخص محض ظاہری اور رسمی انداز میں اسلام کے چند احکامات پر عمل کرتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان شمار کرتا ہے لیکن وہ دل میں اسلامی احکامات اور بنیادی عقائد کی تصدیق نہیں کرتا اور ان کو حق نہیں مانتا تو ایسا شخص بھی کامیاب نہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں کچھ دیہاتی لوگ اپنے آپ کو مسلمانوں کے غلبے سے محفوظ رکھنے اور دیگر فوائد حاصل کرنے کے لیے مسلمان ہو گئے لیکن ابھی انہوں نے دل سے اسلام کو تسلیم نہیں کیا تھا تو اُن کے بارے میں یہ آیت اتری کہ:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات:۱۴): ''یہ بدو (دیہاتی) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، ان سے کہو کہ تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم

مسلمان ہوئے ہیں اور ایمان ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔

معلوم ہوا کہ نہ اکیلا ایمان لانا کافی ہے اور نہ صرف اچھے اعمال کرنا نجات کا ذریعہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا مطالبہ (پورے دین پر عمل کرنا)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ﴾ البقرۃ: ۲۰۸: (ترجمہ: اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ)۔ اور بعض علماء نے یوں ترجمہ کیا ہے کہ ''اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ''۔ ترجمہ جو بھی ہو لیکن اس آیت کے اندر پورے اسلام میں داخل ہونے کا حکم غیر مسلموں کو نہیں بلکہ ان لوگوں کو دیا جارہا ہے جو پہلے سے ہی مسلمان ہیں اور اسلام میں داخل ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ فقط ایمان لاکر اسلام قبول کرنا الگ بات ہے اور پھر تمام کے تمام اسلام میں داخل ہوکر اپنے جملہ اعمال اور پوری زندگی کو اسلام کے تابع بنانا الگ عمل ہے۔ تو کامل مسلمان بننے کے لیے اسلام کے ہر ہر حکم پر عمل کرنا ہے اور اپنے ہر ہر عمل کو اسلام کے مطابق بنانا ہے۔ صرف چند عبادات کو دین سمجھنا اور اپنے مسلمان ہونے کو اپنی مرضی کے مطابق ایک دو اعمال تک محدود رکھنا قطعاً دینداری نہیں بلکہ ضروری ہے کہ دین کے تمام شعبوں سے متعلق علم سیکھ کر پھر اس پر عمل بھی کیا جائے۔ مسلمان کی زندگی میں کوئی ایسا شعبہ، معاملہ اور لمحہ نہیں جہاں جائز و ناجائز کے حوالے سے شریعت کا کوئی حکم موجود نہ ہو لیکن لوگوں کے طرز و انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ شریعت کے احکامات سے آزاد اپنی مرضی کے مالک ہوں۔ مسلمان تب کامل اور کامیاب کہلائے گا جب وہ ہر جگہ دین و شریعت کی پیروی کرے اور اپنی پوری زندگی میں اسلام نافذ کرے۔ صرف چند چیزوں میں اسلام کا نام لینا اور باقی کاموں میں شریعت سے غافل رہ کر اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنا قطعاً دینداری نہیں بلکہ یہ خواہش پرستی ہے۔ اسی ضمن میں یہاں مختصراً

دین اسلام کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جس سے غرض یہ اندازہ لگانا ہے کہ دین کوئی ایک دو چیزوں کا نام نہیں بلکہ یہ بہت وسیع اور زندگی کے ہر ہر معاملے اور واقعے کا احاطہ کرنے والا ہے جہاں ہر عمل میں جائز و ناجائز اور ثواب و گناہ کا پہلو موجود ہوتا ہے۔

دین کے شعبے

جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ انسانی زندگی کے ہر معاملے اور لمحے سے شریعت کے احکامات متعلق ہیں، تو اس لحاظ سے آسانی کی خاطر علماء کرام نے دین کے مختلف شعبے ترتیب دیے ہیں۔ انسانی اعمال سے متعلق شرعی احکام کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔۔شعبۂ عقائد/ ایمانیات

آسان الفاظ میں عقیدے کا مطلب ہے کسی چیز کو دل سے حق اور سچ سمجھنا۔ دوسرے الفاظ میں اس کو ایمان بھی کہتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

> ''اسلام (اعضاء سے متعلق) علانیہ (یعنی ظاہری) چیز ہے اور ایمان دل سے متعلق مخفی (یعنی چھپی ہوئی) چیز ہے''، پھر آپ ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین دفعہ اشارہ کیا اور فرمایا: ''تقویٰ یہاں ہوتا ہے''۔ (مسند احمد)

اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ ایمان دل میں کسی چیز کو حق و سچ ماننے کا نام ہے جس کا اظہار پھر آدمی ظاہری اعضاء کے ذریعے عمل کے ساتھ کرتا ہے۔ شعبۂ عقائد میں وہ امور داخل ہیں جن کا تعلق مسلمان کے ظاہری عمل سے نہیں بلکہ ایمان اور یقین سے ہے، ہاں ان عقائد کے تقاضوں کا تعلق مسلمان کے عمل سے ہوتا ہے، کیونکہ وہ ظاہری عمل انہی اندرونی عقائد کی بنیاد پر کرتا ہے۔ کلمہ طیبہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہونے یا اپنے آپ کو مسلمان تسلیم کر لینے کے بعد سب سے پہلے بنیادی عقائد کو درست اور حق ماننا لازم ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری اور لازمی

عقائد میں سے چند درجہ ذیل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کو واحد لاشریک ذات سمجھنا۔ (۲) اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کو حق جاننا۔ (۳) علم غیب یعنی جن چیزوں کا ادراک واحساس ہم نہیں کر سکتے اور ان کی اطلاع اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے دی ہے، ان پر ایمان رکھنا۔ (۴) ملائکہ پر ایمان رکھنا۔ (۵) اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان رکھنا۔ (۶) تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنا۔ (۷) قیامت کے دن اور اس دن دنیاوی زندگی سے متعلق حساب وکتاب پر ایمان رکھنا۔ (۸) تقدیر پر ایمان رکھنا کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر اور طے شدہ ہیں۔ (۹) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان رکھنا۔ (۱۰) عذاب قبر پر ایمان رکھنا۔ (۱۱) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی ماننا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کے بعد نہ کوئی اور نبی آیا ہے اور نہ قیامت تک آئے گا۔ (۱۲) حضور ﷺ کے اقوال وارشادات کو درست اور حق سمجھنا۔ (۱۳) اللہ تعالیٰ کے جملہ احکامات کو حق اور درست تسلیم کرنا اور ان میں کسی قسم کا کوئی شک نہ کرنا۔ (۱۴) یہ عقیدہ رکھنا کہ اس کائنات میں سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی سے ہوتا ہے اور اس کی چاہت ومنشا کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ کائنات کا نظام چلانے میں اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں۔ وغیرہ۔

2۔۔ شعبۂ عبادات

شعبہ عبادات میں عموماً وہ اعمال وافعال داخل ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے بندوں پر مقرر ہیں۔ عام اصطلاح میں ان کو ''حقوق اللہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، تلاوت قرآن، طہارت، ذکر، صدقات اور ادعیہ وغیرہ۔ ان احکامات واعمال سے دوسرے انسانوں کا کوئی حق متعلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان معاملہ ہوتا ہے۔

3۔۔شعبۂ معاملات وسیاسیات

یہ دین کا وہ شعبہ ہے جو انسانوں کے درمیان ایک دوسرے سے ہونے والے معاملات سے متعلق ہے اور حقوق العباد کا بہت سارا حصہ اسی شعبے میں داخل ہے۔ یہ شعبہ بڑا اہم اور قابل توجہ اس لیے ہے کہ اکثر مسلمان اس میں کوتاہی اور غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سلسلے میں دینی قید سے آزاد سمجھتے ہیں۔ اس شعبے میں بیوعات (خرید وفروخت)، ملازمت، زراعت، نکاح، طلاق، حکومت، سیاست، منصب و عہدہ، گواہی، قضا، فیصلے، تنازعات، ذرائع آمدن، قتل، غیر کا مال ناحق کھانا، کسی کے مال پر قبضہ کرنا، میراث، امانت، چوری، دھوکہ، ملاوٹ، خیانت، وعدہ خلافی، حرام خوری اور ان جیسے دیگر وہ امور شامل ہیں جو لوگوں کے درمیان واقع ہوتے ہیں، یعنی وہ امور جو ایک فرد کی ذات تک محدود نہیں ہوتے بلکہ اُن سے دیگر انسان بھی کسی لحاظ سے متاثر ہوتے ہیں۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس شعبے میں لوگ شرعی احکامات کی بالکل پروا نہیں کرتے بلکہ ان معاملات کو اپنی مرضی، دنیاوی مفادات اور ذاتی اغراض کے تحت سرانجام دیتے ہیں۔

4۔۔شعبۂ معاشرت وآداب

اس شعبے کا تعلق معاشرتی زندگی میں رہنے سہنے، میل جول، ایک دوسرے کے ساتھ تعلق اور انسانی طور طریقوں سے ہے۔ جس میں رسوم و رواجات، باہمی تعلقات، مہمان نوازی، عیادت، خدمت خلق، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، بڑوں کی قدر، چھوٹوں پر شفقت، غریبوں اور ضرورتمندوں کا خیال رکھنا، کسی کو ہاتھ اور زبان سے تکلیف نہ پہنچانا، ملنے جلنے کے انداز، خیرخواہی، ایثار و ہمدردی، رہن سہن، لباس و طعام اور لغویات وفضولیات سے بچنا وغیرہ شامل ہیں۔ اس شعبے میں بھی زیادہ تر حقوق العباد شامل ہیں۔

5۔۔شعبۂ اخلاق واصلاحِ نفس

عام طور لوگ صرف ہنسنے، سلیقے کے ساتھ نرم نرم باتیں کرنے اور خندہ پیشانی کے ساتھ کسی سے ملنے کو اخلاق کہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں اگر کسی شخص کی طبیعت ومزاج میں سختی ہو اور ملنے جلنے کا انداز مختلف ہو تو لوگ اس کو بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ ''اخلاق'' کا مفہوم بہت وسیع ہے؛ دراصل اخلاق انسان کے اندر موجود اس باطنی قوت وطبیعت کا نام ہے جس کی بنیاد پر اُس کے ظاہری اعضاء سے مختلف کام سرزد ہوتے ہیں اور اُس اندرونی کیفیت کا اثر انسان کے ظاہری رویے، طبیعت، مزاج اور طرز وانداز پر پڑتا ہے۔ تو اخلاق آدمی کی وہ نفسانی خصوصیات اور اوصاف ہیں جن کی بناء پر وہ اچھا یا بُرا رویہ اپناتا ہے جو اس کی عادات اور طریقوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ انسانی خصلت وطبیعت کے تحت اخلاق کی دو قسمیں بن جاتی ہیں؛ اخلاق حسنہ (یعنی اچھے اخلاق) اور اخلاق رذیلہ (یعنی بُرے اخلاق)۔ اچھے اخلاق میں اخلاص، صبر وشکر، زبان کی حفاظت اور درست استعمال، غصہ پر کنٹرول، عفوودرگذر، قناعت، بردباری، تواضع وانکساری، محبت، سخاوت، حسن سلوک، اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا، نرم مزاجی، شائستگی اور اچھی گفتگو وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ بُرے اخلاق میں حسد، بغض، کینہ، ریا، تکبر، غرور، غلط زبانی، گالی، چغلی، حرص، دنیا کی محبت، غصہ، شہوت پرستی، جاہ ومنصب کا شوق، بدزبانی، تلخ کلامی، بدمزاجی اور نفرت وغیرہ جیسی چیزیں آتی ہیں۔ قرآن وحدیث کا ایک بڑا ذخیرہ خوش اخلاقی کے فضائل اور بداخلاقی کی مذمت پر مشتمل ہے، جس میں زبان کے درست استعمال سمیت تمام اقسام کے اخلاق شامل ہیں، البتہ لوگوں کے درمیان چونکہ سب سے زیادہ مواقع ظاہری ملاقات اور زبان کے استعمال کے آتے ہیں، اس لیے اخلاق میں نرم مزاجی، اچھی گفتگو، بردباری، غصہ پر کنٹرول، شائستگی اور تواضع وانکساری کی بہت تاکید کی گئی ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں غلط زبانی، بدزبانی، تلخ کلامی اور بدمزاجی کی سخت مذمت آئی ہے۔

تبصرہ

قرآن وسنت کی روشنی میں شریعت مطہرہ کے احکامات بہت زیادہ ہیں اور ہر انسانی عمل سے متعلق ہیں۔ یہاں تمام احکامات اور دینی امور کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ محض سمجھانے کی غرض سے آسانی کی خاطر ان کو درجہ بالا شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور پھر یہاں زیر نظر سطور میں ہر ایک شعبہ کے تحت بطور مثال چند امور اور اعمال کا ذکر کیا گیا، جن سے غرض فقط اتنی ہے کہ دین اسلام کی رعایت مختلف شعبہ ہائے زندگی میں واجب ہے۔ ایک ہم ہیں جو صرف نماز، روزہ اور اپنی مرضی کی چند چیزوں کو پورا دین سمجھ کر اپنے آپ کو مسلمان یا دیندار کہلانے لگے ہیں۔ آج پکے نمازی تو بہت ملتے ہیں، ہر سال حج وعمرہ پر جانے والوں کی بھی کمی نہیں، کثرت سے نوافل پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے والے بھی موجود ہیں، یعنی کسی ایک دو مخصوص اعمال کا خوب اہتمام کرنے والے بہت پائے جاتے ہیں لیکن دین کے تمام شعبوں کی رعایت رکھ کر عمل کرنے والے ''دیندار'' بہت کم ہیں۔ الغرض لوگوں کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے؛ وہ اپنی مرضی اور آسانی کے تحت دین کے کچھ حصوں پر تو عمل کرتے ہیں لیکن اکثر احکامات کو مکمل طور نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ بعض آداب اور مستحبات کے بارے میں علماء سے پوچھتے ہیں اور خوب عمل بھی کرتے ہیں لیکن دوسری طرف اپنی زندگی میں بڑے بڑے گناہوں اور حرام کاموں سے نہیں بچتے۔ جیسے بعض دفعہ بڑے اہتمام سے سوال کرتے ہیں کہ ناخن کاٹنے کا درست طریقہ کیا ہے؟ کھانے کے دوران باتیں کرنا جائز ہیں یا نہیں؟ گول دامن والا لباس بہتر ہے یا سیدھے دامن والا؟ لیکن یہی سوال کرنے والا دوسری طرف معاملات اور اخلاق وغیرہ کے سلسلے میں واضح حرام اور ناجائز کاموں میں مشغول ہوتا ہے، جن کے بارے میں وہ نہ علماء سے پوچھتا ہے اور نہ اُس کو کوئی شوق اور فکر ہوتی ہے کہ اِن کاموں کو بھی شریعت کے مطابق بنایا جائے۔ کچھ لوگ نماز،

قرآن کی تلاوت اور تسبیحات کی بہت زیادہ پابندی کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے یہ اعمال عوام میں بھی مشہور ہوجاتے ہیں لیکن دوسری طرف وہ معاملات وغیرہ کے سلسلے میں بہت زیادہ کمزور ہوتے ہیں۔ بہرحال ہر کوئی اپنی سہولت اور آسانی کے تحت دین کے وہ کام کرتا ہے جن میں دنیا اور نفس کی قربانی نہ دینا پڑتی ہو، اور باقی جگہوں میں اس کو اسلام کی کچھ بھی فکر نہیں ہوتی۔

اعمال اور دل کی اصلاح

دین کے تمام شعبوں پر عمل کے سلسلے میں دو ہی باتیں سامنے آجاتی ہیں؛ ایک یہ کہ بندہ ظاہری اعضاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حضور ﷺ کے ارشادات کی پیروی کرے اور اپنے جملہ افعال و اعمال کو شریعت کے مطابق بنائے یعنی اپنے ہاتھ، آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کا درست استعمال کرے، ہر موقع کی مناسبت سے شرعی اعتبار سے جو کام کرنے کے ہیں وہ کرے اور جن سے منع کیا گیا ہے اُن کاموں سے رک جائے۔ اسی کو عمل صالح کہا جاتا ہے۔ جب آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف موجود ہو تو اس کو جب بھی کسی کام کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں علم ہوجاتا ہے تو وہ فوراً اس پر عمل کرتا ہے اور ہر وہ کام ڈھونڈتا ہے جو زیادہ سے زیادہ نیکی اور ثواب کمانے کا باعث ہو۔ تو اعمال ظاہرہ کی اصلاح یہ ہوئی کہ آدمی کا ہر عمل دین کے مطابق ہو اور اس کے اعضاء سے کوئی خلاف شرع اور گناہ کا کام نہ ہوجائے۔ اس کے ساتھ دوسری بات اپنے دل کی اصلاح ہے، جس کو تزکیۂ نفس بھی کہا جاتا ہے، کہ آدمی اپنے باطن کو بھی ہر قسم کے گناہوں سے صاف کرکے پاکیزہ رکھے۔ جیسے تمام دینی اعمال کو اخلاص کے ساتھ کرنا، تکبر، ریا، بغض، حسد، کینہ، مال کی محبت، گندی سوچ، غلط خیالات اور شہوت پرستی وغیرہ سے اپنے دل کو مکمل طور صاف رکھنا۔ اسی طرح نفسانی خواہشات پر قابو پانا اور دنیا کو بہت حقیر سمجھنا۔

کامیابی کے لیے صرف ظاہری اعمال کی درستی کافی نہیں بلکہ دل کو بھی باطنی گناہوں

سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ سورہ انعام کی آیت ﴿وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ﴾ (اور تم ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہ چھوڑ دو) کی تشریح بعض علماء کرام نے یہی کی ہے کہ یہاں ظاہری اور باطنی گناہوں سے مراد ظاہری اعضاء اور دل کے گناہ ہیں اور ان کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صوفیائے کرام سب سے زیادہ محنت آدمی کے دل پر کرتے ہیں، کیونکہ جب دل کی اصلاح ہو جائے اور آدمی کی پوری توجہ اللہ تعالیٰ پر ہو جائے تو پھر اس کا اثر خود بخود ظاہری اعمال پر پڑتا ہے اور آدمی کے اعمال میں درستی آجاتی ہے۔ جیسے کہ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوگا تو سارا بدن درست ہوگا اور جب وہ فاسد (یعنی خراب) ہو جائے تو سارا بدن خراب ہوگا۔ سن لو! وہ ٹکڑا آدمی کا دل ہے''۔ (بخاری)

اس کا مطلب یہی ہوا کہ پورے بدن اور اعمال کی درستی کا دارومدار دل کی اصلاح پر ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ آدمی اپنے دل کے اندر اچھے اخلاق کو جگہ دے اور برے اخلاق کو نکالدے۔ قرآن کریم کی آیات ہیں:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا، وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ (کامیاب ہوا وہ جس نے اس نفس کو پاکیزہ بنایا اور نامراد (ناکام) ہوا وہ جو اس کو (گناہ میں) دھنسادے)۔

ان آیات کی رو سے کامیاب شخص اس کو قرار دیا گیا ہے جو اپنے باطن کی اصلاح کر کے اس کو گناہوں اور ہر قسم کے شرعی عیوب سے پاک بنادے۔

صرف چند عبادات کو دین سمجھنا

دین اسلام بہت وسیع دین ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں اور سرگرمیوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی موجود ہے؛ کوئی ایسا عمل نہیں ہوسکتا جہاں جائز و ناجائز کے حوالے سے کوئی شرعی حکم موجود نہ ہو۔ ایک آدمی اُس وقت دیندار کہلائے گا جب وہ اپنی پوری زندگی اور ہر عمل کو شریعت کے موافق بنادے۔ آج کل ہر آدمی نے اپنی مرضی سے اپنے لیے دین مقرر کیا ہے۔ اپنی سہولت اور آسانی کے مطابق جس کا دل چاہے وہ ایک دو احکامات پر رسمی طور عمل کر کے سوچتا ہے کہ گویا مسلمان ہونے کا حق ادا ہوگیا۔ عموماً صرف شعبۂ عبادات میں سے نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن اور چند دیگر چیزوں پر توجہ دی جاتی ہے اور باقی سارے معاملات اور امور میں شریعت کا بالکل لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ شعبہ عبادات کے علاوہ دیگر شعبوں اور زندگی کے طور طریقوں میں لوگ اپنے آپ کو گویا شریعت سے بالکل آزاد سمجھتے ہیں۔ ایک طرف پکا نمازی ہوگا، روزانہ قرآن کی تلاوت کرے گا اور رات کو تہجد کے لیے اٹھنا بھی معمول ہوگا لیکن دوسری طرف اُس کی پوری آمدنی حرام کی ہوگی، کاروبار ناجائز ہوگا اور اخلاقی معیار بھی بہت پست ہوگا۔ عام لوگ بھی جب کسی کے متعلق ''دینداری'' کا حکم لگاتے ہیں تو صرف ظاہری طور ایک دو اعمال کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑا نیک اور دیندار ہے، حالانکہ آدمی تب کامل مسلمان بنتا ہے جب وہ اپنی زندگی کا ہر معاملہ قرآن وسنت کی روشنی میں شریعت کے قالب میں ڈال دے۔ انسان کی زندگی کے ہر ہر شعبے جیسے زراعت، صنعت، تجارت، سیاست، شادی غمی، رسوم و رواجات، معاملات، سماجی روابط غرض ہر مقام پر دینی احکامات موجود ہیں۔ تو کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر جگہ اور ہر معاملے میں دینی حکم معلوم کر کے عمل کیا جائے۔

دین کے مطابق زندگی گزارنا مشکل کام ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرما کر اُس کو آزادی نہیں دی بلکہ اُس کو ہر لحاظ سے پابند بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ غیر مسلم تو ظاہر ہے اس دنیا میں مکمل طور آزاد زندگی گزار رہے ہیں لیکن مسلمان کے لیے یہ دنیا اور زندگی ہر لحاظ سے پابندیوں اور سختیوں سے بھری پڑی ہے اور کوئی ایسا لمحہ یا عمل نہیں جس میں وہ اپنی مرضی کا مالک ہو۔ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر وقت جائز و ناجائز اور ثواب و گناہ کو دیکھ کر قدم رکھے گا۔ عام طور ایک جملہ کہا جاتا ہے کہ ''دین بہت آسان ہے لیکن ہم نے مشکل بنا دیا ہے''، ایسا کہنا درست نہیں۔ دراصل یہ جملہ ایک غلط فہمی میں کہا جاتا ہے؛ وہ یہ ہے کہ دین اس لحاظ سے آسان ہے کہ جتنے بھی دینی احکامات ہیں اُن میں سے کوئی ایسا حکم نہیں ہے جو انسان کی طاقت میں نہ ہو یا انسان اس کو بجالانے سے قاصر ہو بلکہ ہر حکم انسان کے لیے قابل عمل ہے۔ اور جہاں انسان کسی عذر کی وجہ سے کوئی حکم ادا کرنے سے قاصر ہو تو وہاں اس کے حق میں وہ حکم ساقط ہو جاتا ہے۔ جیسے حج صرف مالدار اور صاحب استطاعت پر فرض ہے۔ غریب آدمی نہیں کر سکتا تو اس پر فرض بھی نہیں۔ سخت بیماری کی حالت میں نماز اور روزہ اس وقت چھوڑنا یعنی قضا کرنا جائز ہو جاتے ہیں، اسی طرح زکوٰۃ ہے جو صرف صاحب نصاب پر فرض ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دین کے مطابق زندگی گزارنا آسان ہوا یا دین کوئی ایک دو چیزوں پر مشتمل اور چند شعبوں تک محدود نظام ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ دین پر عمل آسان ہے لیکن دین کے مطابق زندگی گزارنا بہت مشکل کام ہے، جس کے لیے اپنی تمام خواہشات اور دنیاوی مفادات کو قربان کر کے نہایت پابندی اور احتیاط کے ساتھ پورا وقت دینا پڑتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

''اَلدُّنیَا سِجنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّۃُ الْکَافِرِ '' دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔(صحیح مسلم)

قید خانہ وہ جگہ ہوتا ہے جہاں قید آدمی کی اپنی کوئی مرضی نہیں چلتی بلکہ وہ مکمل طور پر جیل حکام کی ہدایات اور اصولوں کا تابع ہوتا ہے۔اسی طرح دنیا کو حضورﷺ نے مسلمان کے حق میں اس لیے قید خانہ قرار دیا ہے کہ وہ یہاں ہر طرح کی پابندیوں کے اندر رہ کر زندگی گزارے گا۔دین کوئی مذاق اور رسمی چیز نہیں کہ بندہ ایک دو اعمال کر کے باقی امور میں اپنے آپ کو آزاد اور اپنی مرضی کا مالک سمجھے۔ہر وقت، ہر عمل اور ہر ادا غرض صبح و شام پوری زندگی کا ہر لمحہ مسلمان اس سوچ کے تحت گزارے گا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو جائے۔آمدنی کہاں سے آتی ہے؟۔۔حرام کھاتا ہے یا حلال؟۔۔کاروبار جائز ہے یا ناجائز؟۔۔اس کے مال میں کسی دوسرے کا حق ہے یا نہیں؟۔۔ حقوق العباد کی کتنی رعایت رکھتا ہے؟۔۔زبان، کان اور آنکھ کا استعمال کس طرح ہوتا ہے؟۔۔ اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے یا لوگ اس کے شر سے محفوظ ہیں؟۔۔بغض، حسد، کینہ، غیبت، جھوٹ اور اخلاقی گناہوں میں مبتلا ہے یا نہیں؟۔۔حقوق العباد میں کوتاہی کرتا ہے یا نہیں! اور حقوق اللہ ادا کرتا ہے یا ان سے غافل ہے؟۔۔وغیرہ۔۔الغرض اگر جنت جانے کی امید ہے تو اس کے لیے اپنی تمام تر خواہشات پر پاؤں رکھ کر ہر وقت انتہائی پابندی اور قید کے ساتھ دنیا میں رہنا ہے۔حضورﷺ کا فرمان ہے:

''حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّھوَاتِ وَ حُجِبَتِ الْجَنَّۃُ بِالْمَکَارِہِ'' دوزخ خواہشات نفسانی سے ڈھانپ دیا گیا ہے اور جنت مشکلات (اور دشواریوں) سے ڈھانپ دی گئی ہے۔ (بخاری)

اس حدیث کا سادہ مطلب یہی ہے کہ دنیا میں اپنے آپ کو شرعی پابندیوں سے آزاد سمجھ کر اپنی خواہشات کے مطابق چلنا دوزخ جانے کا باعث ہے جبکہ جنت جانے کے لیے بندہ کو دنیا میں

بہت مشکلات اور شرعی پابندیاں اٹھانی پڑتی ہیں۔ تو اس لحاظ سے کامل مسلمان بننا اور شریعت کے ہر حکم پر عمل کرنا کوئی آسان کام نہیں بلکہ نہایت مشکل کام ہے۔

جو لوگ محض چند عبادات کو کافی سمجھتے ہیں یا جو لوگ صرف رسمی طور پر نام کی حد تک مسلمان ہیں تو وہ کہیں گے کہ دین آسان ہے اور وہ اپنے معمولی سے کام پر بھی مطمئن ہوں گے۔ ہمیں ہر وقت توبہ و استغفار کر کے اللہ تعالیٰ سے رحمت کی طلب کرنی چاہئے لیکن اصولاً بغیر عمل کے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف نہیں دیکھا جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اخروی لحاظ سے کامیابی اور ناکامی کا جو معیار مقرر فرمایا ہے اور جو اصول بھیجے ہیں، ہم انہی کے مطابق عمل کریں گے۔ اگر باوجود سخت محنت اور احتیاط کے پھر بھی انسان ہونے کے ناطے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے سامنے توبہ کر کے معافی طلب کریں گے۔ رہی اللہ کی رحمت تو وہ غفور و رحیم ذات ہے؛ چاہے تو بڑے سے بڑے گنہگار کو بھی جنت لے جائے لیکن ایسی بات قطعاً نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفت رحم کے باعث عمل ہی چھوڑ دیں اور پورے تیئیس سال میں مکمل ہونے والے دین کو انتہائی محدود کر کے مذاق بنا دیں۔ اسی مضمون کی ایک حدیث آگے ایک عنوان کے تحت آئے گی۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد

اللہ تعالیٰ نے بندوں پر دو قسم کے حقوق مقرر کیے ہیں؛ حقوق اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق) اور حقوق العباد (یعنی بندوں کے حقوق)۔ حقوق اللہ سے مراد وہ حقوق ہیں جو بندوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کے لیے مقرر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان امور ہوتے ہیں جن سے کسی دوسرے انسان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جیسے نماز، روزہ، حج، تلاوتِ قرآن اور ذکر و اذکار وغیرہ۔ حقوق العباد سے مراد وہ حقوق اور ذمہ داریاں ہیں جو بندوں کے آپس میں ایک دوسرے

سے متعلق ہوتے ہیں یعنی ایک بندے کے دوسرے پر عائد ہوتے ہیں اور ان کی ادائی ایک انسان دوسرے کے لیے کرتا ہے۔ جیسے والدین کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، عورتوں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، کسی کے مال، جان اور عزت کا تحفظ کرنا، اپنی زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچانا، کسی کی غیبت نہ کرنا، کسی کو دھوکہ نہ دینا، ناحق قتل نہ کرنا، کسی کے مال پر ناجائز قبضہ نہ کرنا، چوری نہ کرنا وغیرہ۔ غرض جہاں بھی کوئی ایسا عمل یا معاملہ ہو جس سے اچھائی یا برائی کے لحاظ سے دوسرا انسان متاثر ہوتا ہو تو اس کا تعلق حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق سے بن جاتا ہے۔ حقوق اللہ کی طرح حقوق العباد کے خیال رکھنے کا حکم بھی اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ دوسرے انسان کا حق ادا کرے۔ تو اس اعتبار سے حقوق العباد میں سے ہر حق ''حق اللہ'' بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں قسم کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے خیال رکھنے کا حکم ہے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں کا ایک طبقہ حقوق اللہ کا تو کچھ نہ کچھ خیال رکھتا ہے، جیسے نماز، روزہ، نوافل اور تلاوت قرآن وغیرہ کا تو مناسب اہتمام ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کی اکثریت حقوق العباد (بندوں کے حقوق) میں کوتاہی اور غفلت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک لحاظ سے حقوق العباد کی ادائیگی اور ان کا خیال رکھنا زیادہ اہم ہے؛ وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنا حق توبہ واستغفار سے معاف بھی فرما دیتا ہے، اسی طرح بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کو بندے کا کوئی نیک عمل اتنا پسند آجاتا ہے کہ اُس کی وجہ سے وہ اس کے دیگر گناہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہوتا ہے، معاف فرما دیتا ہے، لیکن بندوں کے حقوق کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتا۔ اگر حقوق العباد میں کسی سے کمی اور کوتاہی ہوجائے تو اس کا حل یہ ہے کہ اگر کسی کے مال وغیرہ پر قبضہ کیا گیا ہے، یا چوری اور دھوکہ سے کسی کی کوئی چیز لے لی گئی ہے تو وہ چیز اصل مالک کو واپس لوٹا دی جائے۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنی زبان اور ہاتھ سے تکلیف دی گئی ہے یا دیگر حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی گئی ہے تو اُس شخص کے

پاس جا کر اس سے معافی مانگی جائے۔ مثلاً کسی کی غیبت کی ہے، کسی کو گالی دی ہے، کسی کی بے عزتی کی ہے، کسی کے دل کو دُکھایا ہے وغیرہ تو جا کر اس شخص کو اتنا راضی کیا جائے کہ وہ معاف کرے۔ جب تک وہ بندہ خود اپنا حق معاف نہیں کرتا یا اس کو حق واپس نہیں کیا جاتا، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ وہ گناہ معاف نہیں فرماتا۔

یہ بڑا باریک اور حساس معاملہ ہے۔ لوگوں نے صرف چند عبادات اور حقوق اللہ کے کچھ حصے کو پورا دین سمجھ لیا ہے اور دوسری طرف بندوں سے متعلق حقوق کا بالکل خیال نہیں کرتے۔ یہی عمل قیامت کے دن خسارے اور نقصان کا باعث بنے گا۔ اس سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بہت قابل غور ہے، جس سے حقوق العباد کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حدیث ہے:

> ایک دفعہ حضور ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ بتاؤ سب سے بڑا مفلس (غریب) کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا، ہم تو مفلس ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس درہم اور مال و متاع نہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میری امت کا سب سے بڑا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ (جیسی نیکیاں) لے کر حاضر ہوگا، لیکن اُس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا ناحق مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا، تو اس (شخص) کی نیکیاں اُن لوگوں کو دی جائیں گی (جن کا حق مارا گیا ہے) اور اگر اس کے ذمہ جو حق تھا اس کی ادائیگی سے پہلے پہلے اس شخص کی نیکیاں ختم ہوجائیں تو ان لوگوں (یعنی جن کو اس شخص نے تکلیف پہنچائی تھی ان کے) گناہ اس شخص کے سر پر ڈال دیے جائیں گے اور (پھر) اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ (مسلم)

یہ حدیث اس لحاظ سے قابل غور ہے کہ ایک شخص نے دنیا میں حقوق اللہ ادا کیے ہوں گے اور بہت ساری نیکیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوا ہوگا لیکن حقوق العباد میں غفلت اور کوتاہی کی وجہ سے وہ تمام نیکیاں اس کے کچھ بھی کام نہ آئیں گی اور الٹا دنیا میں جن لوگوں کے حقوق میں اس نے نقصان کیا تھا اُن کے گناہ بھی اس کے نامۂ اعمال میں آئیں گے اور یہ شخص جہنم کا مستحق قرار پائے گا۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''شہید کے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں مگر کسی شخص کا قرض (یعنی حق)'' (مسلم)۔ یعنی اگر اس شہید کے ذمہ کسی کا قرض یا کوئی اور حق ہو تو وہ معاف نہیں ہوگا۔ سوچنے کی بات ہے کہ شہادت کا کتنا بڑا مقام ہے لیکن اس سے بھی حقوق العباد معاف نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں نیکیوں کی حفاظت والی بات بھی آتی ہے کہ ثواب کا کوئی کام کرنا تو آسان ہے لیکن پھر اس کو محفوظ رکھنا مشکل ہے۔ ہم نمازیں پڑھیں، تلاوت کریں اور دیگر اعمال و افعال سے بہت ساری نیکیاں کمائیں لیکن ان نیکیوں کی حفاظت تب ہوگی جب ہم حقوق العباد میں کوتاہی نہ کریں ورنہ یہ ساری نیکیاں قیامت کے دن ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں گی۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ دین کا ایک چوتھائی حصہ عبادات یعنی حقوق اللہ پر مشتمل ہے اور باقی تین حصوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، لیکن آج دین کے اس بڑے حصہ کو مکمل طور نظر انداز کیا جا رہا ہے؛ غیبت، چغلی، دھوکہ، چوری، تہمت و الزام تراشی، گالی دینا، کسی کا دل دُکھانا، ناحق قتل، لوگوں کو بے عزت کرنا، عیوب سے پردہ اٹھانا، خفیہ سازشیں کرنا، لوگوں کو آپس میں لڑانا، عورتوں کو میراث میں حصہ نہ دینا، کسی کی زمین اور مال پر ناحق قبضہ کرنا، تنازعات میں حق فیصلہ نہ کرنا، امانت میں خیانت کرنا، راز کی بات دوسروں پر ظاہر کرنا، ملاوٹ کرنا، وعدہ خلافی کرنا، اپنی ملازمت اور نوکری کا حق ادا نہ کرنا، کام چوری کر کے اپنی ڈیوٹی درست طور انجام نہ دینا، تجارت اور لین دین میں خراب اور غیر معیاری چیز کو ٹھیک اور معیاری بتانا، وغیرہ کتنے

ایسے گناہ ہیں جو آج بہت عام ہوگئے ہیں اور ان سب کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ بہت سارے صوم وصلوٰۃ کے پابند لوگ ہوتے ہیں لیکن وہ حقوق العباد کو بری طرح پامال کرتے ہیں اور دیگر لوگ ان کے شر اور برائی سے محفوظ نہیں ہوتے۔ الغرض عبادات اور حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق پر بھی پوری توجہ دینی چاہئے کیونکہ ان کے بغیر فقط عبادات انسان کی نجات اور خلاصی کے لیے کافی نہیں ہوسکتیں۔

اس مقام پر ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ آج کل جدید دنیا میں ''حقوق'' کے الفاظ بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں، جیسے عورتوں کے حقوق اور بچوں کے حقوق وغیرہ۔ تو یاد رہے مسلمانوں کے معاشرے میں حقوق سے صرف وہی حقوق مراد ہوں گے جو شریعت نے مقرر کیے ہیں اور جن کی تشریح قرآن وسنت میں آئی ہے، ورنہ آج کل تو عورتوں کی طرف ایسے خود ساختہ حقوق کی نسبت کی جاتی ہے جن کا اسلام سے کچھ بھی تعلق نہیں بلکہ الٹا بے حیائی اور گناہ کے باعث ہیں۔ اسی طرح انسانی حقوق سے مراد بھی وہ حقوق ہوں گے جن کی وضاحت شریعت میں موجود ہو۔

دین سیکھنا ہر ایک کی اپنی ذمہ داری ہے

نیک ومتقی بننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے دین سیکھا جائے اور پھر اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ دین کو محفوظ رکھنے اور اس کی تبلیغ واشاعت کے سلسلے میں علماء کرام، مبلغین، مدرسین اور مصنفین وغیرہ روز اول سے اپنی محنت میں مصروف ہیں اور وعظ ونصیحت کے ذریعہ بے خبر لوگوں کو نہ صرف خبردار کرتے ہیں بلکہ اُن کو آمادہ کرکے شرعی احکامات پر عمل کروانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کرام کو قرآن وحدیث کے علم جیسی عظیم نعمت سے نوازا ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی ذمہ داریاں بھی دیگر لوگوں کے مقابلے میں زیادہ

ہوں گی اور وہ دین کی تبلیغ اور معاشرے کی اصلاح میں اپنی استطاعت کے مطابق کردار ادا کریں گے۔ اگر وہ اپنی حیثیت اور علم کے مطابق کام نہ کریں اور اس سلسلہ میں غفلت کریں تو اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھے گا لیکن یہ اللہ تعالیٰ اور ان علماء کرام کے درمیان معاملہ ہے۔ آج دور میں عموماً ہر علاقے میں علماء کرام، مبلغین اور دین کا علم رکھنے والے دیگر لوگ مختلف طریقوں سے اپنی محنت میں مصروف ہیں۔ اس لحاظ سے عوام کو علماء کرام وغیرہ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کہیں سے بھی دین سیکھنا اور اس کی طلب کرنا ہر ہر مسلمان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ جس طرح اپنی دنیاوی ضروریات کی تکمیل اور اپنے بدن کے علاج کے لیے کوئی بھی کسی کے تعاون، مشورے اور حکم کے انتظار میں نہیں بیٹھتا بلکہ از خود اسباب تلاش کر کے اپنی حالت اور صحت بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی غافل اور بے کار بیٹھتا ہے تو دوسرے لوگ اس کو برا بھلا کہہ کر ملامت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ قرآن وحدیث اور شرعی احکامات سیکھنے کا از خود اہتمام کر کے عمل کی کوشش کرے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی ڈاکٹر اور لیبارٹری والا ایسا نہیں کرتا کہ ضروری آلات اور دوائیاں لے کر گھر گھر اور گاؤں گاؤں گھومے، لوگوں کی تشخیص کرے اور اُن کے امراض معلوم کرنے کے بعد ان کا علاج کرے بلکہ بیمار لوگ از خود ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں، اپنے بدن اور بیماری کی تشخیص کرواتے ہیں، اور پھر اس کے مطابق علاج کروا کر دوا استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ مریض کو اپنے علاج کی فکر ہوتی ہے اس لیے وہ مریض نہ تو اپنے علاج سے غافل رہتا ہے اور نہ اس انتظار میں ہوتا ہے کہ کوئی ڈاکٹر اس کے گھر آ کر اس کا علاج کرے گا بلکہ وہ مریض جہاں بھی ہو کسی ماہر ڈاکٹر اور معیاری لیبارٹری کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ جتنا وقت لگے اور جتنا خرچ آئے لیکن وہ اپنے جسمانی علاج کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرتا ہے۔ بعینہ یہی معاملہ روحانی علاج کا ہے کہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ اس انتظار میں نہ بیٹھے کہ کوئی عالم دین یا مبلغ آ کر اُس کو دینی احکام سکھائے، بلکہ بحیثیت مسلمان وہ از خود

نکل کر جائز و ناجائز امور اور شریعت کے احکامات معلوم کرے گا اور پھر اس کے مطابق عمل کرے گا۔ جیسے وہ مشہور حدیث ہے:

''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (ابن ماجه)

ہر آدمی کو اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاں جا کر اپنا حساب دینا ہے۔ اس لیے دنیا میں بھی ہر کوئی خود اپنے علم اور پھر اس پر عمل کا ذمہ دار ہے، کہ وہ دنیا کی تمام دیگر چیزوں اور اسباب کے لیے صبح و شام محنت میں مبتلا ہونے کی طرح اپنے دین، قبر اور آخرت کی بھی خود فکر کرے گا اور ہر وہ راستہ ڈھونڈے گا جو اس کی اُخروی کامیابی کا باعث بنے۔ بعض دفعہ کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ علماء کرام فلاں فلاں مسئلے کے بارے میں منبر پر بات نہیں کرتے یا ہمیں نصیحت نہیں کرتے، تو ٹھیک ہے اگر وہ نہیں کرتے تو آپ خود جا کر ان سے معلوم کریں اور پھر دوسروں کو بھی بتائیں۔ یا اگر آپ کو اتنی فکر ہے تو جا کر خود عالمِ دین بن جائیں اور پھر منبر پر بیٹھ کر عوام کو بھی آگاہ کریں۔ اس قسم کے لوگ صرف نفرت کی بناء پر علماء کرام پر ایسے اعتراضات کرتے ہیں، ورنہ اگر ان کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو سینکڑوں ایسے احکامات جن کے بارے میں ان کو پتہ بھی ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان پر عمل نہیں کرتے۔ تو جن مسائل و احکامات کو علماء کرام صبح و شام بیان کرتے ہیں، ان پر کتنا عمل ہوا کہ اب باقی کا انتظار ہے۔ علماء کرام جیسے بھی ہوں، اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل اور اس کی اشاعت و تبلیغ کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرتے ہیں، اس لیے ان لوگوں کو قطعاً اعتراض کا حق نہیں جو دین و مذہب کے لیے کچھ بھی نہیں کرتے اور ان کی پوری زندگی دنیا کے گرد گھومتی ہے۔

کتنا علم سیکھنا فرض ہے؟!!

غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شرعی اعتبار سے ہر گاؤں یا علاقے کے لوگوں

کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے میں سے ایک دو یا چند افراد منتخب کر کے علمِ دین سیکھنے کے لیے بھیج دیں، تاکہ وہ قرآن وحدیث اور دین کے بارے میں تمام ضروری مسائل کا علم سیکھ کر واپس آئیں اور پھر باقی لوگ حسب ضرورت اپنے شرعی مسائل کے سلسلے میں ان علماء کی طرف رجوع کریں اور ان سے رہنمائی حاصل کریں۔ جب تک یہ لوگ علم دین سیکھنے کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوں تو علاقے کے باقی لوگ ان کے گھروں کا خرچہ برداشت کریں اور حصول علم میں بھی ان کے ساتھ تعاون کریں۔۔۔۔۔رہی عوام تو اُن کے لیے اسلام کا اتنا علم سیکھنا فرض ہے جس کے تحت وہ اپنی روزمرہ کی زندگی شریعت کے مطابق گزار سکے۔ اصولاً جن جن کاموں سے کسی کا واسطہ پڑتا ہے تو ان کاموں سے متعلق شریعت کا حکم معلوم کرنا فرض ہوجاتا ہے۔ کچھ امور اور اعمال تو ایسے ہیں جن کا سیکھنا اور ان سے متعلق علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر بہر صورت فرض ہے، جیسے نماز، روزہ، اخلاق، حقوق العباد اور معاشرات کے بعض امور جبکہ کچھ امور ایسے ہیں جن کا علم ہر کسی پر ہر وقت فرض نہیں ہوتا، لیکن جب کسی کا اُس کام سے واسطہ پڑتا ہے تو اسی وقت اُس پر اس کام سے متعلق علم حاصل کرنا لازم ہوجاتا ہے۔ مثلاً حج کے مسائل سیکھنا اس وقت فرض ہوجاتے ہیں جب کوئی آدمی صاحب استطاعت ہو کر حج پر جانے کا ارادہ کرلے۔ اگر کوئی تجارت کرتا ہے تو اس کے ذمہ خرید وفروخت کے شرعی مسائل سیکھنا واجب ہوجاتے ہیں۔ اگر کسی کا تعلق زراعت سے ہو تو وہ زراعت کے احکام ومسائل معلوم کرے گا، اگر کوئی قاضی بنتا ہے تو وہ قضا کے بارے میں علم حاصل کر کے احکامات سیکھے گا۔ وغیرہ۔۔۔۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر کوئی مدرسہ جا کر عالم، مدرس، فقیہ اور مفتی نہیں بن سکتا اور نہ یہ ہر کسی سے مطلوب ہے لیکن دین کا اتنا علم ہر مرد وعورت پر فرض ہے جس کے مطابق وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں صبح وشام پیش آنے والے امور کو شریعت کے مطابق انجام دے۔

علم، عمل اور اخلاص

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے تین چیزیں مطلوب ہیں؛ علم، عمل اور اخلاص۔ علم کے ذریعے انسان کو پتہ چل جاتا ہے کہ اسلام انسان سے کیا چاہتا ہے، جائز اور ناجائز کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے۔ الغرض علم حاصل کرنے سے بندہ زندگی گزارنے کا طریقہ سمجھ جاتا ہے کیونکہ اسلام کا علم سیکھے کے بغیر آدمی کی مثال آندھے کی ہوتی ہے جس کو راستے کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مسلمان پر اتنا علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے جس کے تحت وہ اپنی معمول کی زندگی گزار سکے۔ لہٰذا ہر وقت کوئی بھی ذریعہ استعمال کر کے اپنے علم میں اضافے کی کوشش کرنی چاہئے اور اپنی زندگی کے مختلف امور میں مسلسل علماء کرام سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے۔

اب اکیلا علم حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ جتنا علم آجائے، اس کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ جن جن کاموں کو کرنے کا اسلام نے حکم دیا ہے وہ کام کرنے ہیں اور جن جن کاموں سے روکا ہے، ان سے رُک جانا ہے۔ عمل کے ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ دینی احکامات پر عمل کا جو طریقہ شریعت نے بتایا ہے، اسی طریقے کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ دینی احکامات پر اپنی مرضی اور ذاتی سوچ کے مطابق عمل کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔ عصر حاضر میں مختلف طریقوں سے لوگوں کے پاس علم تو آجاتا ہے لیکن عمل میں بہت کمزوری پائی جاتی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ کہ اسلام کے بہت سے احکامات سے لوگ اب بھی غافل ہیں لیکن جن باتوں کا پہلے سے علم ہے، ان کے مطابق بھی عمل نہیں ہو رہا۔

تیسری چیز اخلاص ہے کہ آدمی جتنے بھی نیک اعمال کرے گا وہ تمام اعمال خالص اللہ

تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہوں گے۔ ان میں کسی قسم کی ریا کاری اور دکھلاوا نہیں ہوگا۔ عبادت میں ریا کاری پورے عمل کو برباد کر دیتی ہے۔ ریا کے لیے کیے جانے والے عمل پر آدمی کو کچھ بھی اجر نہیں ملتا بلکہ وہ الٹا گنہگار ہوکر مستحق عذاب ٹھہرتا ہے۔ اخلاص کے ساتھ چھوٹے سے چھوٹے عمل پر بھی اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے جبکہ ریا اور دکھاوے کے لیے ہونے والے بہت بڑے عمل کو بھی اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔ کتنی احادیث میں یہ باتیں آئی ہیں کہ قیامت کے دن نمازیوں، روزہ داروں، شہیدوں اور صدقہ کرنے والوں کو یہ کہہ کر جہنم میں ڈالا جائے گا کہ تم نے دنیا میں یہ اعمال اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو دیندار اور نیک ظاہر کرنے کے لیے ریا کاری کے طور پر کیے تھے۔ اس لیے تمھاری غرض دنیا میں پوری ہوگئی تھی اور آج آخرت میں تمھیں ان اعمال کا کچھ فائدہ نہ ملے گا۔ انسانی مزاج کے اندر دکھاوے اور اپنے کردار کو لوگوں میں ظاہر کرنے کا عنصر پایا جاتا ہے، اس لیے دینی احکامات پر عمل کے اندر بھی اخلاص پیدا کرنا اور اپنی نیت کو خالص بنانا ایک مشکل کام ہے لیکن اس کے بغیر چونکہ عمل قبول نہیں ہوتا اس لیے اپنے اعمال کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے اخلاصِ نیت پر خاص توجہ دینی چاہئے۔ بہتر نیکی وہ ہے جس کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے ہو اور لوگوں کو پتہ بھی نہ چلے۔ چونکہ اپنے نفس پر کنٹرول مشکل ہے اس لیے دکھاوے سے بچنے کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آدمی فرائض وواجبات کے علاوہ ثواب کی نیت سے دیگر نیکیاں اور عبادات بالکل چھپ کر کرے اور حتی الامکان لوگوں کے سامنے کرنے سے گریز کرے تاکہ اس کی نیت میں کسی قسم کی خرابی نہ آئے۔

زندگی عارضی ہے

دنیاوی زندگی بہت کم اور عارضی ہے؛ یہاں کی خوشی اور غمی دونوں کا اعتبار نہیں۔ اگر کوئی انسان بہت خوش اور تمام دنیاوی لذتوں اور آسائشوں سے مالا مال ہے تو اس کی یہ خوشی اور آسانی کتنی دیر رہے گی! بہت جلد اس کو رخصت ہو کر ان تمام مال و دولت اور دنیاوی اسباب سے خالی ہاتھ قبر میں جانا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی اس دنیا میں کتنی ہی مشکلات اور پریشانیوں میں مبتلا ہو تو یہ بھی عارضی امر ہے اور اس کو قبر کی طرف کوچ کر کے جانا ہے، جہاں صرف عمل کے لحاظ سے انسان کو اچھا یا برا بدلہ ملے گا۔

موت جیسی تلخ اور یقینی حقیقت کے باوجود بھی یہ سنگدل انسان دنیا کے پیچھے پڑا ہوا ہے، ورنہ حق تو یہ تھا کہ دنیا کی راحت اور خوشی کے بارے میں سوچا بھی نہ جاتا۔ ہم روزانہ کتنے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں دفن کرتے ہیں لیکن اس سے سبق اور نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ اپنے ہی طرح کے دوسرے انسان کی موت اور پھر اُس کو قبر میں دفن کرتے وقت یہ ضرور سوچ لینا چاہئے کہ ایک دن مجھے بھی اسی طرح کفنایا اور دفنایا جائے گا اور میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے فنا ہو جاؤں گا اور پھر مجھے پتہ بھی نہ چلے گا کہ میرے پیچھے کیا ہوتا ہے۔ ایک حدیث منقول ہے کہ:

كَفىٰ بِالْمَوْتِ وَاعِظاً۔

(واعظ اور نصیحت کرنے والے کے طور پر موت ہی کافی ہے)

جس کا مطلب یہ ہے کہ روزانہ دوسرے لوگوں کی موت زندہ رہنے والوں کے لیے بڑی نصیحت ہے کہ وہ زندگی کی انتہا کے بارے میں سوچ کر قبر کے لیے تیاری شروع کریں، اور اسی طرح اپنی موت کی ہولناکی کو بھی یاد کر کے نصیحت حاصل کریں اور گناہوں سے بچ جائیں۔ اسی لیے تو ایک اور حدیث میں ہر وقت موت کو یاد رکھنے کا حکم ہے تاکہ انسان قبر کی زندگی سے غافل ہو کر صرف

دنیا کی فکر میں لگا نہ رہے۔ارشاد ہے:

اَکْثِرُوا ذِکْرَ هَاذِمِ اللَّذاتِ یَعْنِی المَوْتَ(ترمذی)

''لذتوں کوتوڑنے والی چیز یعنی موت کوکثرت سے یادکیا کرو''۔

یہی قبروں میں موجودلوگ ہیں جوکبھی ہماری طرح اس دنیا میں رہے؛ یہاں کی لذتوں، راحتوں اورسہولتوں میں خوش وخرم رہے لیکن آج قبر کے اندر اُن کے ساتھ صرف دنیاوی عمل کے اعتبار سے معاملہ ہوگا کہ ثواب کے کام کتنے کیے ہیں اور گناکتنا کمایا ہے، اللہ تعالیٰ کوراضی رکھنے کی کتنی فکرتھی اوراپنے نفس وخواہش کی پیروی کرکے شیطان کوکتنا خوش کیا تھا!! ملکوں پرحکومت کرنے والے بڑے بڑے جابر بادشاہ، عظیم الشان محلات میں رہنے والے، طاقتور پہلوان، خوبصورت اورتوانا جسم والے نوجوان، بڑی بڑی جاگیروں کے مالک، غرض کیسے کیسے لوگ اس زمین نے نگل لیے جن کا آج کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ نہ دنیا کا وہ مال ودولت ان کے کام آیا اور نہ شہرت و منصب نے ان کو کچھ نفع دیا۔بس انسان ہے جودنیا کے نقدسودا میں مشغول ہوکرآخرت کی ابدی زندگی کو بھول گیااور اپنی تمام صلاحیتوں کو اس عارضی دنیا کے لیے استعمال کرتا جارہاہے۔۔ارشادباری تعالیٰ ہے کہ

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی﴾تم دنیاوی زندگی کوترجیح (وبرتری) دیتے ہوجبکہ آخرت (کی زندگی اس سے) بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔

حضورﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ''اس دنیا میں مسافر اور راستہ چلنے والے کی طرح رہو'' (بخاری)اورحضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ''(زندگی کا کچھ بھی اعتبارنہیں) جب تم پرشام کا وقت آجائے توصبح کا انتظار نہ کرواور جب صبح آجائے توشام کا انتظار نہ کرو''۔ایک حدیث شریف میں ان الفاظ کا بھی اضافہ ہے کہ''اپنے آپ کوقبروالوں میں سے شمارکرلو''یعنی ہر

وقت یہ سوچو کہ ابھی مجھے موت آ کر میں اللہ تعالیٰ کے حضور قبر میں پہنچنے والا ہوں۔ ایک اور حدیث میں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ:

''مجھے دنیا سے کیا مطلب ہے! میری اور دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سوار ہو جو ایک درخت کے نیچے سایہ حاصل کرنے کے لیے بیٹھے، پھر وہاں سے کوچ کر جائے اور درخت کو اسی جگہ چھوڑ دے''۔ (ترمذی)

سوچنے کی بات ہے کہ کسی راستہ پر پیدل چلنے والا مسافر جب تک کسی جگہ آرام کرتا ہے تو وہ اُس جگہ بیٹھنے کے لیے صوفے، چھت اور رہنے کی دیگر چیزیں نہیں بناتا اور نہ کوئی اور اہتمام کرتا ہے بلکہ چند لمحے کسی درخت کے نیچے پتھر پر بیٹھ کر کچھ دیر آرام کے بعد وہاں سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اُس کی پوری نظر اس مقام پر ہوتی ہے جہاں وہ پہنچنا چاہتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں بھی انسان اپنے آپ کو مسافر سمجھے، اصل نظر اپنی منزل یعنی قبر اور اس کے مابعد پر ہو اور پوری تیاری اور محنت اسی کے لیے ہو۔ دنیا کو مختصر وقت کے لیے محض آرام گاہ سمجھ کر اس کے لیے بس اتنا کچھ کرے کہ صرف وقت گزر جائے۔ ویسے بھی یہ دنیا اور اس سے متعلق تمام چیزوں اور اعمال کی اللہ تعالیٰ کی نظر میں کچھ بھی حیثیت اور وقعت نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (العنکبوت:۶۴) ''اور یہ دنیوی زندگی کھیل کود کے سوا کچھ بھی نہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے، اگر یہ لوگ جانتے ہوتے''۔

یعنی جس طرح کھیل اور دیگر تماشوں میں کچھ وقت کے لیے عارضی طور لوگوں کے لیے خوشی کا موقع ہاتھ آتا ہے لیکن یہ چیزیں اور ان کی خوشی مستقل نہیں ہوتی بلکہ انسان خالی ہاتھ گھر لوٹتا ہے، اسی طرح دنیا کی زندگی میں بھی اگر کوئی خوشیاں ڈھونڈتا ہے تو وہ عارضی کام کی تلاش میں ہے۔

اس لیے پوری توجہ آخرت کی تیاری پر دینی چاہئے۔ جیسے ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا، وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحَاتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَاباً وَ خَیْرٌ اَمَلاً ﴾ (الکہف:۴۶) ''مال اور اولاد (صرف) دنیوی زندگی کی زینت ہیں اور جو نیکیاں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں وہ تمھارے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں اور امید وابستہ کرنے کے لیے بھی بہتر ہیں''۔

یعنی مرنے کے بعد یہ دنیاوی مال و دولت اور اولاد کام نہیں آئے گی بلکہ صرف دنیا کے نیک کام وہاں فائدہ دیں گے جو انسان کی خلاصی کے باعث بنیں گے۔ اگر انسان اپنے مستقبل کی بہتری کی امید رکھتا ہے تو وہ ان دنیاوی کاموں میں نہیں بلکہ نیک اعمال میں مشغول رہے۔ نیک عمل کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہی زندگی دی ہے۔ یہاں سے ہی نیکیوں کا توشہ ساتھ لیکر جانا ہے۔ مرنے کے بعد پھر مصروفیات، غربت اور دیگر کوئی بھی حیلہ و بہانہ قبول نہ ہوگا۔ آج انسان لمبی لمبی امیدوں کے ساتھ اس دنیا میں رہ رہا ہے اور ایسی تیاریوں میں مصروف ہے جیسے اس کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جانا نہیں۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے اہل حمص سے فرمایا: ''تمہیں حیا نہیں آتی کہ تم ایسے مکانات تعمیر کرتے ہو جو تمھارا ہمیشہ رہنے والا ٹھکانہ نہیں۔ ایسی امیدیں رکھتے ہو جنہیں نہیں پا سکتے اور ایسا سامان اکٹھا کرتے ہو جسے اپنے استعمال میں نہیں لاتے۔ تم سے پہلی امتوں نے عالیشان عمارتیں بنوائیں، بہت مال و دولت اکٹھا کیا اور لمبی لمبی امیدیں رکھیں لیکن ان کی امیدوں نے دھوکہ دیا اور ان کا جمع کیا ہوا سامان برباد اور ان کی عمارات قبریں بن گئیں''۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''مجھے اپنی امت کے متعلق خواہش نفس اور لمبی آرزو کا سب سے زیادہ اندیشہ ہے، کیونکہ خواہش نفس حق سے روکتی ہے، جبکہ لمبی آرزو آخرت بُھلا

دیتی ہے، اور یہ دنیا چلی جارہی ہے، جبکہ آخرت چلی آرہی ہے اور دونوں میں سے ہر ایک کے طلبگار ہیں؛ تم دنیا کے طلبگار نہ بنو، عمل کرتے رہو، کیونکہ آج تم عمل کی جگہ میں ہو اور کوئی حساب نہیں اور کل آخرت میں ہوں گے اور کوئی عمل نہیں ہوگا'' (مشکوٰۃ)۔

ایک موقع پر حضور ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ تم سب جنت میں جانے کی خواہش رکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کی، ہاں۔ آپ نے فرمایا: امیدیں کم کرو اور اللہ تعالیٰ سے کما حقہ حیا کرو۔ صحابہ کرام نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ہم اللہ تعالیٰ سے شرم کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: حیا وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ حیا یہ ہے کہ تم قبروں اور ان کی تکالیف کو یاد کرو، پیٹ کو حرام سے محفوظ رکھو، دماغ کو برے خیالات کی آماجگاہ نہ بناؤ اور جو شخص آخرت کی عزت کا خواہاں ہے وہ دنیاوی زینتوں (اور خوشیوں) سے احتراز کرے۔ یہی حقیقی حیا ہے اور اسی سے بندہ کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

نصیحت کے چند جملے

☆ ہر وقت ہنسی اور مذاق میں رہنے والا انسان وہ وقت بھی یاد رکھے جب فرشتے آکر اس کی روح قبض کررہے ہوں گے۔

☆ اونچے اور اعلیٰ مکانات ومحلات بنانے سے قبل اپنی تنگ وتاریک قبر کو ذہن میں لایا جائے۔

☆ خوبصورت اور قابل فخر لباس پہنتے وقت کفن کو یاد رکھا جائے۔

☆ دنیا اور مال ودولت کے پیچھے بھاگنے سے پہلے قبر کے تین سوالوں پر سوچا جائے۔

☆ شہرت اور دنیاوی دوستیوں کی طلب کے وقت قبر کی تنہائی پر غور کیا جائے۔

☆ اولاد، رشتہ داروں اور دوست واحباب کی خاطر جائز وناجائز اور حق وناحق کی تمیز کے بغیر

بہت کچھ کرنے کے دوران روزِ محشر کا تصور کیا جائے، جب کوئی بھی ساتھ نہ ہوگا اور یہاں کی رشتہ داریاں اور دوستیاں کچھ بھی کام نہ آئیں گی۔

☆ دنیا میں تکبر اور غرور سے زندگی گزار کر اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے سے پہلے اس وقت پر سوچا جائے جب قیامت کے دن ہر کوئی بے اختیار اور بے یار و مددگار انتہائی پریشانی کے عالَم میں کھڑا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکے گا۔

☆ دنیا میں راحتیں، خوشیاں اور آسائشیں ڈھونڈ کر اپنے آپ کو معمولی سی تکلیف سے بچا کر رہنے والا دوزخ کی آگ کو بھی ذہن میں رکھے۔

☆ اپنی عزت بڑھانے کی فکر میں مبتلا انسان ذرا وہ لمحات بھی یاد رکھے جب قیامت کے دن اس کو پوری مخلوق کے درمیان حساب و کتاب کے لیے نام کے ساتھ پکارا اور بلایا جائے گا۔

دنیا پرستی اور مال و دولت جمع کرنا

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ یہ دنیا اور زندگی دونوں عارضی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ انسان بڑی بڑی امیدوں کے ساتھ سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا ہے۔ صبح و شام لوگوں کی پوری محنت فقط اسی دنیا کی دولت، شہرت اور لذت کے لیے ہے؛ لوگوں کے باہمی رابطے، اٹھنا بیٹھنا اور مشاورت وغیرہ سب کچھ دنیا ہی کے حوالے سے ہوتا ہے۔ ہر کوئی اس غم میں مبتلا ہے کہ جیسے بھی ہو مجھے زیادہ سے زیادہ مال و دولت اور عہدے مل جائیں۔ کتنا عجیب معاملہ ہے کہ لوگ محنت دنیا کے لیے کرتے ہیں اور جو کچھ کماتے ہیں تو دنیا ہی کے لیے کماتے ہیں یعنی جو کچھ ہاتھ آتا ہے وہ واپس اسی دنیا اور دنیاوی امور پر ہی خرچ کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف لوگوں کی نظروں میں کامیاب بھی وہی کہلاتا ہے جو دنیاوی لحاظ سے مال و دولت اور شہرت و عزت کا مالک ہو۔ محض رسمی انداز میں چند عبادات پر عمل کے علاوہ لوگوں کی توجہ اور محنت کا محور دنیا ہی ہے اور ان کے دل

ہر وقت صرف دنیا کے ساتھ پیوست رہتے ہیں۔ دنیا سے محبت کرنا اور اس کو دل میں بسانا اتنا نقصان دہ عمل ہے کہ اس سے آدمی کے نیک کام بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز ایسے لوگ آئیں گے جن کے نیک اعمال پہاڑوں کے برابر ہوں گے، لیکن انہیں دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: وہ نماز، روزہ ادا کرنے والے ہوں گے؟ فرمایا: ہاں وہ روزہ دار اور رات کا ایک حصہ عبادت میں گزارنے والے ہوں گے لیکن وہ دنیا کے دلدادہ (یعنی دنیا سے محبت کرنے والے) ہوں گے۔ ایک اور جگہ حضور ﷺ کا فرمان مبارک ہے:

> ''دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو، اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہ ہو، بے وقوف ہی اسے جمع کرتا ہے، جاہل ہی اس کے لیے جھگڑتا ہے، ناسمجھ ہی اس کے لیے دشمنی اور حسد کرتا ہے اور بے یقین ہی اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے''۔

مال و دولت بذات خود بری چیز نہیں، کیونکہ مال کا صحیح استعمال باعث اجر و ثواب ہے، اسی طرح دنیاوی زندگی گزارنے کے لیے بھی انسان کو مال و دولت کی ضرورت ہے، کیونکہ دنیوی حوائج اور ضروریات کی تکمیل مال و اسباب کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے جائز حدود کے اندر تجارت و ملازمت یا کسی اور جائز ذریعہ سے مال کمانا نہ صرف جائز بلکہ باعث ثواب ہے، لیکن جو مذمت اور برائی بیان کی جاتی ہے تو وہ درحقیقت دنیا پرستی اور مال پرستی کی مذمت ہے، کہ وہ آدمی برا ہے جو ہر وقت دنیا اور مال کی حرص میں مبتلا ہو اور اپنے دین سے غافل ہو۔ اس لیے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''ہلاک ہو درہم اور دینار کا بندہ'' یعنی جس کی پوری زندگی صرف روپے جمع کرنے اور دولت کمانے کے گرد گھومتی ہو، وہ شخص ہلاک ہو گیا۔ دنیا چیز ایسی ہے کہ اس میں مبتلا شخص موت تک پھر اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اس کی محبت جب ایک دفعہ دل

میں اتر جاتی ہے تو پھر انسان کی سوچ میں بس یہی دنیا اور اس کی ترقی ہوتی ہے، اور یہ شخص ہر وقت دنیا ہی کے غم میں بے قرار رہتا ہے۔ اسی سلسلے میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ: ''جس کی سب سے بڑی خواہش دنیا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دل پر چار چیزوں کو مسلط کر دیتا ہے؛ دائمی غم، دائمی مشغولیت، دائمی محتاجی اور کبھی نہ پوری ہونے والی خواہشات''۔ حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا تو ابلیس اپنے ساتھیوں کے پاس آیا، انہوں نے ابلیس کو بتایا کہ ایک نبی بھیجا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی امت بھی ہے۔ ابلیس نے پوچھا: کیا وہ لوگ دنیا کو پسند کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں۔ ابلیس نے کہا: پھر تو کوئی پروا نہیں؛ اگر وہ بتوں کو نہیں پوجتے تو نہ پوجیں، ہم انہیں تین کاموں میں الجھا دیں گے: دوسروں کی چیز لینے، غیر پسندیدہ (یعنی غیر ضروری اور غلط) جگہوں پر خرچ کرنے اور لوگوں کے حقوق ادا نہ کرنے۔ یہی تین چیزیں تمام برائیوں کی بنیاد ہیں۔ حضرت سعید بن مسعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جس کی دنیا میں اضافہ ہوا اور آخرت کم ہو رہی ہو لیکن وہ اس بات پر خوش ہو تو سمجھ لو کہ وہ شخص دھوکہ میں مبتلا ہے کہ اس کی شکل مسخ کی جا رہی ہے اور اسے محسوس بھی نہیں ہو رہا۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لوگوں کے لیے نفسانی خواہشات کی چیزوں کی محبت کو خوشنما بنا دیا گیا ہے، (جیسے) عورتیں، بچے، سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیت، (لیکن) یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے اور جو بہتر ٹھکانا ہے وہ اللہ کے پاس ہے﴾ (آل عمران: ۱٤)

یعنی لوگ دنیا پرستی کے تحت دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لیے عورتوں، اولاد، مال و دولت، جائیداد اور خوبصورت سواریوں کی محبت میں مبتلا ہیں اور ان کے دلوں کو یہ چیزیں بھلی اور

خوبصورت لگتی ہیں، حالانکہ یہ تمام چیزیں بہت عارضی اور ان کا نفع صرف اس دنیوی زندگی تک محدود ہے، اور بہتر انجام اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جو نیک اور دیندار لوگوں کو قیامت میں ملے گا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''ہر انسان دل میں تین حسرتیں لے کر مرتا ہے؛ ایک یہ کہ وہ اپنے جمع شدہ مال سے سیر ہوتا، لیکن نہیں ہوا۔ دوسری یہ کہ وہ اپنی امیدوں کو پایہ تکمیل تک پہنچاتا، لیکن نہ پہنچا سکا اور تیسری یہ کہ وہ آخرت کے لیے نیک اعمال بھیجتا، لیکن نہ بھیج سکا''۔ بہر حال کافروں کی تو غرض ہی اسی دنیا سے ہے کہ یہاں زیادہ سے زیادہ مال و دولت جمع کر کے ہر قسم کی خوشیاں حاصل کریں لیکن مسلمان جس کی پوری نظر قبر اور آخرت پر ہونی چاہئے تھی وہ بھی اپنی حقیقی زندگی اور اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بالکل غافل ہو کر اسی دنیا کے پیچھے لگا ہوا ہے اور ایک لمحہ کے لیے یہ نہیں سوچتا کہ میں اس دنیا کو چھوڑ کر جانے والا ہوں۔ ایسے ہی آخرت سے غافل اور دنیا میں خوش رہنے والے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿جو لوگ ہم سے (آخرت میں) ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی اور مطمئن ہو گئے اور جو ہماری نشانیوں (احکامات) سے غافل ہیں، ایسے لوگوں کا ٹھکانا اپنے اعمال کی وجہ سے آگ (یعنی جہنم) ہے﴾ (یونس: ۷، ۸)

یعنی ان لوگوں نے دنیا کو سب کچھ سمجھ کر اسی دنیا کے مال و دولت کو پسند کیا اور مکمل اطمینان کی زندگی گزار گئے۔ اسی کرتوت کی بناء پر ایسے غافل لوگوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ شیطان نے بھی کہا تھا کہ ﴿لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الحجر: ۳۹) کہ میں انسانوں کے لیے دنیا میں دلکشی پیدا کروں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا۔ ایک حدیث میں ہے: ''ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال۔ فرمایا: آدم کے بیٹے (انسان)! تیرے مال میں تیرے لیے صرف وہی ہے جو تم نے کھا کر فنا کر دیا، یا پہن کر پرانا کر دیا، یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا'' (صحیح مسلم)۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾ (تمھیں زیادہ سے زیادہ جمع کرنے (کے شوق) نے غافل کر رکھا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ گئے)

یعنی تم اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ مال، عزت اور عہدے وغیرہ جمع کرنے اور اس سلسلے میں ایک دوسرے سے مقابلے کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہو کہ اچانک تمھیں موت آ جاتی ہے اور تمھاری پوری کمائی اسی دنیا میں رہ جاتی ہے۔ لہٰذا مال و دولت اور صرف دنیا ہی میں مبتلا شخص کو کچھ لمحات کے لیے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ جس گھر میں میرے آباواجداد رہتے تھے آج وہاں میں رہتا ہوں۔ یہی گھر اور زمینیں ہوں گی لیکن میں ان کو چھوڑ کر قبر میں پہنچ چکا ہوں گا۔

دنیاوی اسباب اختیار کرنا

پہلے بتایا گیا کہ انسان کی پیدائش کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پورا وقت اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حضور ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے میں گزارے گا۔ جن کاموں کے کرنے کا حکم ہے وہ کرے گا اور جن کاموں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے اُن سے دور رہے گا۔ ہر مسلمان زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمانے اور اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کی فکر میں ہوگا۔ کوئی بھی عمل کرتے وقت یہ ضرور ذہن میں لانا ہوگا کہ یہ عمل مرنے کے بعد قبر میں مفید ہوگا یا نقصان اور خسارے کا باعث۔

یہ تو زندگی کا اصل مقصد ہے لیکن جب انسان اس دنیا میں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو وقت گزارنے کے لیے اُس کو ضروریات کے تحت کچھ دنیاوی تدابیر اور اسباب بھی اختیار کرنے پڑتے ہیں؛ جیسے گھر، زمین، لباس و طعام، ذرائع آمدن، زراعت و صنعت، شادی، استعمال کی اشیاء اور زندگی کے لیے ضروری یا اس میں آسانی پیدا کرنے کے لیے دیگر لوازمات۔ یہ چیزیں انسان کی زندگی میں بنیادی ضروریات کی حیثیت رکھتی ہیں اور اِن کے بغیر نہ تو انسان پرسکون زندگی گزار سکتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ان

تمام دنیاوی اسباب وضروریات کو مقصد اصلی نہیں بنایا جائے گا کہ آدمی کی پوری صلاحیت، محنت، سوچ وفکر، مشورے اور تگ ودو انہی اسباب کے لیے وقف ہوجائیں بلکہ ان کو صرف ضرورت کے درجے میں رکھ کر اصل توجہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور شریعت کے احکامات بجا لانے پر ہوگی۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ، وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (اے ایمان والو! تمھاری دولت اور تمھاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں۔اور جولوگ ایسا کریں گے تو وہ خسارے میں ہوں گے)۔(المنافقون: آیت:۹)

ظاہر ہے مال و دولت اور اولاد کا تعلق دنیاوی اسباب و تدابیر سے ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا کہ ان چیزوں پر اتنی توجہ نہ دو کہ تم اللہ اور اپنے دین کو بھول جاؤ اور پوری توجہ انہی چیزوں پر رہے۔اسی طرح ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نیک اور دیندار لوگوں کے اوصاف میں ارشاد فرماتا ہے کہ: ﴿یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں کوئی تجارت یا خرید وفروخت نہ اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے، نہ نماز قائم کرنے سے اور نہ زکوٰۃ دینے سے۔وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور نگاہیں الٹ پلٹ کر رہ جائیں گی﴾ (النور:۳۷) یعنی لوگ دنیاوی اسباب وتدابیر میں لگے رہیں لیکن اس حد تک کہ ان کی وجہ سے وہ اپنے دین پر عمل کرنے سے غافل نہ ہوجائیں۔آج اگر غور کیا جائے تو مسلمانوں کی اکثریت دنیاوی اسباب یعنی مال و دولت، شہرت اور ترقی کے حصول میں مذہب سے مکمل طور غافل ہے۔ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جس کی چوبیس گھنٹے کی زندگی میں منٹوں کے حساب سے بہت کم وقت دینی امور جیسے نماز اور سال میں ایک دفعہ رمضان کے روزوں میں صرف ہوتا ہے اور باقی پورا وقت دنیا کے لیے وقف ہے۔شاید بہت کم اللہ والے ایسے ہوں گے جن کی زندگیاں صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور خوشنودی کے لیے وقف ہوں گی۔

یہ بہت بڑا لمحۂ فکر ہے کہ مسلمان اپنے مقصدِ زندگی سے بہت دور چلا گیا ہے۔ اس کی زندگی بالکل جانوروں کی طرح کھانے پینے میں گزر جاتی ہے۔ کیا انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا تھا کہ وہ صرف کھائے گا، پیئے گا، زیادہ سے زیادہ مال جمع کرے گا، دولت وشہرت کے مقابلے ہوں گے، صبح سے شام تک اُس کا پسینہ صرف دنیا کے لیے بہے گا اور اُس کی مجالس، مشورے، رابطے، اٹھنا بیٹھنا، گھومنا پھرنا اور اپنی طاقت وصلاحیت کو استعمال کرنا صرف دنیا اور دنیاوی اسباب کمانے کے لیے ہوگا؟ آج کا مسلمان دنیاوی لذات، خواہشات کی تکمیل اور آسانیوں کے حصول میں اتنا مبتلا ہوگیا ہے کہ وہ دین ومذہب سے بالکل بے خبر اور غافل ہوکر رہ گیا ہے۔ عقل کا دعویدار یہ آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا کم عقل ہے کہ اس کو دنیا میں کس غرض کے لیے پیدا کیا گیا تھا جبکہ وہ دیگر چیزوں میں مصروف ہوکر اصل غرض سے کتنا دور ہوتا جارہا ہے!۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ ایک آدمی کسی دفتری کام کے سلسلہ میں یہاں سے اسلام آباد روانہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ مقامی اڈے پر کسی اچھی گاڑی اور مرضی کی سیٹ ڈھونڈنے میں وقت ضائع کرتا ہے۔ پھر راستہ میں تفریحی مقامات پر گاڑی رکوا کر تصاویر کھینچتا ہے۔ جگہ جگہ فروٹ کھانے اور جوس پینے کے لیے رُک جاتا ہے۔ اسلام آباد پہنچ کر پہلے سیاحتی اور تاریخی مقامات کی سیر کرتا ہے، پھر کھانے وغیرہ کے لیے اچھے سے ہوٹل اور ریسٹورنٹ کی تلاش میں وقت لگاتا ہے۔ آخر میں جب مطلوبہ کام کے لیے دفتر پہنچ جاتا ہے تو وقت ختم ہونے کے باعث دفتر بند ہوتا ہے۔ یوں یہ آدمی اپنے کام اور غرض کے بغیر پریشانی کے ساتھ واپس گھر لوٹ آتا ہے۔ ظاہر ہے تمام لوگ اس آدمی کو بڑا بے وقوف کہیں گے کہ اس نے غیر ضروری امور میں وقت ضائع کرکے اپنے آپ کو اصل غرض سے محروم کیا۔ اُس کو دفتر تک پہنچنے کے لیے درکار اسباب اور تدابیر کو صرف اس حد تک اختیار کرنا چاہئے تھا کہ اُس کا اصل مقصد چھوٹ نہ جاتا۔ ہر کوئی کہے گا کہ مذکورہ آدمی کو اچھی گاڑی اور مرضی کی سیٹ کے بجائے کسی بھی

عام سی گاڑی میں سوار ہوکر جانا چاہئے تھا، راستہ میں تصاویر بنانے پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے تھا، اس دن اگر وہ سرے سے کھانا ہی نہ کھاتا تو کچھ نہ ہوتا، اسلام آباد میں تفریحی مقامات دیکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اسی طرح ہوٹل اور ریسٹورنٹ ڈھونڈنے سے پہلے اس کو سیدھا دفتر پہنچ جانا چاہئے تھا تاکہ بروقت اپنا کام اور مقصد پورا کرجاتا۔

یہی مثال اس دنیا کی ہے کہ انسان یہاں دنیاوی خواہشات کی تکمیل اور اسباب کی تلاش میں منہمک ہوکر مقصدِ اصلی بھول چکا ہے۔ مرنے کے بعد یہ انسان بڑی حسرت اور افسوس کے ساتھ کہے گا کہ اے کاش! دنیا میں میری کوئی عزت نہ ہوتی، مال نہ ہوتا، گھر وزمین سے محروم رہ جاتا، کسی قسم کی سہولت نہ ہوتی، اچھے اچھے کھانے نہ کھاتا، معیاری لباس نہ پہنتا، لوگوں کی نظروں میں میری کوئی وقعت وحیثیت نہ ہوتی، کسی فٹ پاتھ پر رہ کر وقت گزار لیتا لیکن اپنے مقصد اصلی کو پہچان کر اللہ تعالیٰ کو راضی کرکے اپنی آخرت سنوارتا اور آج دن کی اس بڑی رسوائی اور دوزخ کی آگ سے بچ جاتا۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی چوبیس گھنٹے کی زندگی پر غور کرے کہ ان میں سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نیکیاں کمانے میں کتنا وقت گزرتا ہے اور دنیاوی امور میں کتنا وقت ضائع ہوجاتا ہے۔ اس عارضی زندگی کی خاطر ہم اپنی آخرت کو کس طرح خراب کررہے ہیں، جبکہ حق یہ تھا کہ آخرت کی خاطر دنیا کو برباد کیا جاتا۔ یہ بہت مشکل ہے کہ آدمی دنیا کی آسائشوں، لذتوں اور راحتوں کو بھی ڈھونڈے اور دوسری طرف اپنے ایمان واسلام کو بھی محفوظ رکھ سکے۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ایسا بھی آیا ہے:

> ''جس نے دنیا کو پسند کیا، اس نے آخرت کا نقصان کیا اور جس نے آخرت کو پسند کیا تو اُس نے دنیا کو نقصان پہنچایا۔ تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دو''۔ (مشکوٰۃ)

معلوم ہوا کہ دنیا کے پیچھے چلنے سے آدمی ضرور اپنے دین سے غافل ہوکر خسارہ اٹھائے گا اور جس

کی توجہ آخرت پر ہوگی وہ دنیاوی راحتوں اور مال و دولت سے دور رہے گا۔ حدیث کے آخری ٹکڑے کا یہی مطلب ہے کہ اس عارضی اور فانی زندگی کے لیے تیاری اور محنت کے مقابلے میں اُس اُخروی زندگی کے لیے محنت کرو جو ہمیشہ اور نہ ختم ہونے والی ہے۔ ایک روایت منقول ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ : يَا ابْنَ آدَمَ صَاحِبِ الدُّنيَا بِبَدَنِکَ وَ فَارِقْهَا بِقَلْبِکَ وَ هَمِّکَ ۔ ترجمہ: (اے آدم کے بیٹے (انسان)! دنیا میں اپنے بدن کے ساتھ رہ، اور اپنے دل اور ہمت کے ساتھ اس سے جدا رہ)۔ یعنی تو دنیا کے اندر ہی زندہ ہے، اس لیے صرف اسباب اور وقت گزارنے کی حد تک تو تیرا بدن دنیا میں رہے لیکن تیرا دل اور محنت دنیا سے بالکل الگ رہے۔ نہ تو دل میں تیری دنیا سے کچھ محبت ہو اور نہ عملی لحاظ سے پوری کوشش صرف دنیا ہی کے لیے ہو۔ اہل اللہ کا یہ جملہ بھی مشہور ہے کہ: ''دل بہ یار، دست بہ کار''۔

جدید تعلیم اور اسباب کی ضرورت واہمیت

عام طور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ علماء کرام اور مذہبی طبقہ عصری تعلیم اور جدید سائنسی علوم کا مخالف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی جدید علوم اور سائنس کی مخالفت نہیں کرسکتا اور نہ کوئی مخالف ہے، کیونکہ آج کی دنیا میں عصری علوم اور سائنس وٹیکنالوجی کی اہمیت وضرورت سورج کی طرح واضح ہے۔ آج جو دنیاوی سسٹم رواں دواں ہے اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں انسان کو جتنی آسانیاں ملی ہوئی ہیں، یہ جدید علوم اور سائنس کی وجہ سے ہیں۔ گھر کے کمرے سے لیکر باہر کی دنیا تک ہر انسان روزانہ کی بنیاد پر مختلف شکلوں میں سائنس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ ان عصری علوم کے بغیر نہ تو لوگ آگے جاسکتے ہیں اور نہ ملک ترقی کرسکتا ہے۔ اگر جدید تعلیم اور سائنسی علوم کا یہ سلسلہ بند ہوجائے تو پورا سسٹم رُک جائے گا اور لوگ سخت مشکلات کا شکار ہوجائیں گے۔ مسلم

معاشروں اور حکومتوں کی ذمہ داریوں میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ ہر شعبہ میں لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہر ممکن طریقہ اختیار کریں اور مختلف شعبوں کے لیے ماہر افراد تیار کریں۔ اسی طرح اقوامِ عالم کے درمیان ایک زندہ قوم کی حیثیت سے رہنے کے لیے بھی سائنس وٹیکنالوجی اور دیگر علوم ضروری ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ جدید علوم کے بغیر ممکن نہیں۔ آج ہماری صحت، زراعت، صنعت، دفاع، آمدورفت، مواصلات، نقل و حمل، لباس وطعام اور تعمیرات وغیرہ غرض زندگی سے وابستہ ہر ہر چیز وعمل میں جدید علوم اور سائنس کا دخل ہے۔

معاشرے کو جس طرح چھوٹے پیمانے پر کسان، کارپینٹر، دکاندار، نائی، درزی، لوہار، مستری اور دیگر افراد کی ضرورت ہے، اسی طرح بڑے مسائل کے حل اور سہولیات فراہم کرنے کے لیے جدید سائنسی علوم کے حامل افراد کی بھی ضرورت ہے۔ اجتماعی لحاظ سے مسلمانوں اور بالخصوص مسلم حکومتوں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ وقت اور زمانہ کے لحاظ سے حسب ضرورت سائنس وٹیکنالوجی پر اتنی توجہ دیں کہ غیر مسلم اقوام کا مقابلہ کرسکیں اور اپنا دفاع بھی ممکن بنائیں، بلکہ آج تو سائنس کے بغیر دنیا میں مسلمانوں کے لیے اپنا دفاع ممکن بھی نہیں۔ قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ ترجمہ: (اور جس قدر قوت (وطاقت) تم سے ہوسکے، اُن (کافروں) کے مقابلے کے لیے تیاری کرو)۔ (الانفال: ٦٠) اس آیت کی رو سے آج کے زمانہ میں مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لیے سائنس کے میدان میں اتنا آگے جائیں کہ غیر مسلم اقوام کا مقابلہ کرسکیں اور ان پر اپنا رعب جمائے رکھیں۔

ایک فطری قانون کے تحت انسان کی پیدائش سے لیکر آج تک یہ نظام قائم ہے اور ہر کام کے لیے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ انفرادی طور پر یہ کسی کی ذمہ داری میں نہیں آتا کہ وہ

معاشرے کو مذکورہ شعبوں میں خدمات دینے میں ضرور اپنا کردار ادا کرے۔ ہر زمانہ میں مختلف افراد اپنے ذاتی رجحانات، خواہشات و جذبات اور ملنے والے مواقع کی بنیاد پر کوئی ایک کام کرتے رہتے ہیں۔ اب اصل بات پر آتے ہیں کہ دنیاوی ضروریات کے تحت ان تمام چیزوں اور علوم کی حیثیت اسباب کے درجے میں ہے، اس لیے مسلمان ان اسباب وضروریات میں اس حد تک مشغول ہوگا کہ زندگی کا اصل مقصد فوت نہ ہوجائے۔ انفرادی طور پر جو بھی عصری تعلیم حاصل کر کے کسی شعبہ میں اپنی خدمات پیش کرنے کی خواہش رکھتا ہے یا بغیر جدید تعلیم کے کسی دنیاوی محنت اور کسب میں لگا رہتا ہے تو اس پر ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے دین و مذہب سے مکمل طور آگاہ ہوگا اور کسی بھی موقع پر شرعی احکامات پر عمل کرنے سے غافل نہیں رہے گا۔ کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان بنے، ڈاکٹر بنے، انجنیئر بنے، بزنس مین بنے یا کسی اور شعبہ میں اعلیٰ درجے کا منصب وعہدہ حاصل کرے لیکن دوسری طرف وہ دیندار اور شرعی احکامات پر عمل کرنے والا ہو اور ایک باشرع مسلمان کی شکل میں اپنی خدمات سرانجام دے رہا ہو۔ اگر جدید تعلیم اور کاروبار دنیاوی ضرورت ہے، جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو دین سیکھنا اور اس پر عمل کرنا قبر اور آخرت کی ضرورت ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے زندگی کا حساب وکتاب دینا ہے۔ اب ہر کوئی ان دونوں ضرورتوں پر خود سوچے کہ ان کو کتنا اور کس طرح وقت دینا ہے۔ انفرادی طور پر ہر شخص سب سے پہلے یہ سوچے گا کہ دنیاوی ضروریات وسہولیات کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اس سلسلے میں کوئی کام کرنے سے میری زندگی کا اصل مقصد متاثر تو نہیں ہوگا۔ قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں کوئی کام دنیاوی لحاظ سے کتنا ہی اہم اور ضروری کیوں نہ ہو، لیکن اگر اس کی وجہ سے کوئی شخص اپنے مذہبی فرائض اور عبادت سے غافل ہوجاتا ہے یا اس کام کے اندر کسی بھی شکل میں گناہوں میں پڑ جانے کا خطرہ موجود ہو، تو پھر وہ کام ناجائز ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص جدید تعلیم اور کاروبار کی دنیا میں ایسے انداز میں داخل ہوسکتا ہے کہ اس کا دینی نقصان نہ ہو اور وہ اپنی زندگی

کے اصل مقصد پر نظر رکھ کر دنیا پرستی اور مادہ پرستی سے بچ سکتا ہو تو ایسا شخص یقیناً بہت بڑا باکمال ہوگا۔ شریعت کی نظر میں بھی ایسا شخص زیادہ اہم اور قابل تحسین ہے جو بیک وقت دنیا و آخرت دونوں کو سنبھال سکتا ہو۔ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے، معاشرے کی ضروریات، مختلف اسباب کی اہمیت اور مجموعی سسٹم میں آسانیاں وغیرہ سے پہلے اپنے دین، قبر اور آخرت کی فکر کرے۔

اب علماء کرام اور مذہبی طبقہ کی مخالفت والی بات کی طرف آتے ہیں؛ دراصل مخالفت جدید تعلیم اور دنیاوی کاروبار و تجارت کی نہیں ہے بلکہ دنیا پرستی اور دین سے غفلت والے ماحول کی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ جو بھی شخص دنیوی اسباب وضروریات اور مختلف قسم کی خدمات میں مصروف ہوگیا ہے تو پھر اس کی صبح سے شام تک کی پوری زندگی، محنت، صلاحیت اور اٹھنا بیٹھنا بس اسی دنیا اور اسباب کے لیے ہوجاتا ہے اور اس کی زندگی کا تھوڑا سا وقت بھی دین میں استعمال نہیں ہوتا۔ علماء کرام اگر لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں تو وہ اس لحاظ سے نہیں کہ یہ دنیوی تعلیم ہے بلکہ اس وجہ سے کہ یہاں لڑکیوں کے لیے شرعی حدود کے اندر تعلیم کا کوئی انتظام موجود نہیں۔ گھر سے اکیلی باہر جاکر کالج و یونیورسٹیوں کے مخلوط نظامِ تعلیم میں شرعی پردہ کے بغیر رہنا اور تعلیم حاصل کرنا دینی و اخلاقی لحاظ سے واقعی درست عمل نہیں۔ کوئی بھی عالم اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ عورتوں کے علاج کے لیے ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے لیکن لیڈی ڈاکٹر بنتی کہاں اور کیسی ہے، اس پر تحفظات ضرور ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ دینی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ افراد کے عقائد و نظریات میں بگاڑ آجاتا ہے، اس لیے علماء کرام کو اعتراض کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں بہتر یہ ہے کہ اگر کسی کو دنیاوی شعبوں میں اخلاص نیت کے ساتھ خدمات سرانجام دینے کا شوق ہے تو پہلے وہ دینی علوم حاصل کرے اور نیک و صالح بن کر کسی بھی محکمہ و شعبہ میں جائے اور وہاں اپنے دین

پر مکمل طور عمل پیرا رہے۔ اس بات کی پوری کوشش کرے کہ وہ کسی بھی وقت دنیا پرستی میں پڑ کر قبر، آخرت اور نیک اعمال سے غافل نہ رہے۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ علماء کرام جدید دور کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے یا وہ جدید دور کے تقاضوں کی مخالفت کر کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ انتہائی غلط اور بے جا اعتراض ہے۔ اس لیے کہ اگر جدید دور کے تقاضوں سے مراد جدید علوم حاصل کرنا، سائنس و ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنا، نئی نئی ایجادات کرنا، ترقی کے راستے ڈھونڈنا، صنعت و زراعت اور معیشت میں آگے جانا، دفاعی ساز و سامان تیار کرنا، مشینیں بنانا اور انسانی صحت کی خاطر تعلیم حاصل کرنا اور اعلیٰ سے اعلیٰ دوائیاں تیار کرنا ہو تو علماء کرام نے کبھی بھی ان تقاضوں کی مخالفت نہیں کی ہے اور نہ ان کے راستے میں رکاوٹ بنے ہیں بلکہ ان چیزوں کو ضروری اور اہم سمجھتے ہیں۔ البتہ اگر کوئی اپنے ذہن میں عریانی، فحاشی، رقص و سرود کی محفلوں کا انعقاد، مخلوط تقریبات، لہو و لعب اور شرعی حدود پار کر کے دیگر حرام چیزوں کو جدید دور کے تقاضے سمجھتا ہے تو علماء کرام ضرور ان کے مخالف ہیں کیونکہ اسلام ان چیزوں کی اجازت نہیں دیتا اور دوسری طرف یہ جدید دور کے تقاضے نہیں بلکہ انسانی نفس اور خواہشات کی غیر ضروری مطالبے ہیں۔

تقویٰ اور اس کے تقاضے

تقویٰ کا لفظی معنی ہے ''بچنا''، ''بچاؤ'' اور ''اجتناب''۔ تو شریعت کی اصطلاح میں اس کا معنی گناہوں سے بچنا بنے گا۔ چونکہ یہ لفظ قرآن و حدیث میں ''ڈر'' اور ''خوف'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اس لیے قرآن و حدیث کے مختلف مقامات میں اس لفظ کے استعمال کو دیکھ کر تقویٰ کا پورا مفہوم یہ بنتا ہے کہ آدمی ہر وقت اپنے دل میں خوفِ خدا رکھے اور لمحہ لمحہ گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرے۔ اتنی احتیاط والی زندگی گزارے کہ اُس سے گناہ اور خلافِ شریعت

کام نہ ہوجائے۔اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ معاملات اور سرگرمیوں میں ہر وقت اور ہر موقع پر گناہوں سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کی فکر کرے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ تقویٰ یعنی اللہ تعالی سے ڈرنے اور گناہوں سے بچنے کا حکم دیا ہے۔غور کیا جائے تو تمام اعمال، احکامات اور عبادات کا اصل نچوڑ اور مقصود یہی ''تقویٰ'' ہے اور شریعت کی طرف سے مطالبہ بھی ''متقی'' بننے کا ہے۔

تقویٰ اور گناہوں سے بچ کر احتیاط والی زندگی کے لیے ایک بہت خوبصورت مثال پیش کی جاتی ہے: آدمی ایک ایسی کھیت میں داخل ہونا چاہتا ہے جس کے گرد جھاڑیوں اور کانٹوں کا بھاڑ لگا ہوا ہے۔ یہ آدمی جب اُس بھاڑ کے اوپر کھیت کے اندر داخل ہوگا تو اپنی چادر اور کپڑوں کو مکمل طور سمیٹ کر اپنا پاؤں اٹھا کر بھاڑ کے اوپر اتنی احتیاط کے ساتھ کھیت کے اندر رکھے گا کہ اُس کے بدن میں کوئی کانٹا نہ چبھے، چادر اور کپڑوں میں کوئی کانٹا نہ الجھے اور نہ اس کے کپڑے جھاڑیوں میں پھنس جائیں۔اس بھاڑ کو عبور کرتے وقت مذکورہ آدمی جو انتہائی احتیاط کرتا ہے یہی ''تقویٰ'' ہے کہ آدمی اپنی پوری زندگی میں لمحہ لمحہ اتنی احتیاط کرے گا کہ اس سے کسی بھی عمل میں گناہ نہ ہوجائے۔جب مذکورہ آدمی اُس بھاڑ کو پار کر کے اندر جائے گا تو باوجود انتہائی احتیاط کے پھر بھی اس کے بدن اور کپڑوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ کانٹے ضرور لگے ہوں گے۔ یہ ایسا ہے کہ جیسے انسان حتی الامکان اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے لیکن پھر بھی انسان ہونے کے ناطے احتیاط کے باوجود اس سے گناہ ہوجاتا ہے۔جس آدمی کے کپڑوں میں کانٹے لگے ہیں وہ اِن کو یوں ہی نہیں چھوڑتا بلکہ فوراً اپنے بدن اور کپڑوں کو کانٹوں اور دیگر چیزوں سے صاف کرتا ہے۔اسی طرح جب انسان سے گناہ ہوجاتا ہے تو وہ بھی اس پر قائم نہیں رہے گا بلکہ فوراً توبہ کر کے اس گناہ سے باز آئے گا۔وہ آدمی جب کھیتوں میں آگے گھوم پھرے گا تو اُس کے بدن اور کپڑوں کو احتیاط کے باوجود پھر بھی مزید کانٹے اور دیگر چیزیں لگیں گی اور وہ اس کو صاف کرتا

جائے گا۔ اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی میں ہر وقت احتیاط کرے گا لیکن اگر کبھی کوئی گناہ ہوجائے تو فوراً استغفار کر کے اپنے نفس کو صاف کرے گا۔ اسی انداز میں اس کی زندگی تقوی یعنی خوفِ خدا اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام کے ساتھ جاری رہے گی۔ تقویٰ کا مفہوم سمجھانے کے لیے مذکورہ مثال کے قریب قریب ایک مثال حدیث شریف میں پیش کی گئی ہے جو احادیث کی کتابوں میں موجود ہے۔

مسلمان اس دنیا کے اندر مال و دولت کی حرص، لذات و خواہشات، نفس و شیطان، مادہ پرستی، معاشرتی رسوم و رواجات غرض ایک دو نہیں بلکہ گناہوں کی طرف رغبت دلانے والے بیسیوں سینکڑوں عوامل کے درمیان پھنسا ہوا ہے۔ ہر لمحہ یہ خطرہ موجود ہے کہ آدمی سے کسی نہ کسی شکل میں کوئی گناہ واقع ہوجائے۔ ایسی حالت میں بات ''تقویٰ'' کی آجاتی ہے کہ ہر وقت انتہائی احتیاط کے ساتھ زندگی گزاری جائے اور اپنے آپ کو گناہ سے محفوظ رکھا جائے۔ آج کے دور میں تو گناہوں اور گناہوں پر آمادہ کرنے والی چیزوں کی اور کثرت ہوگئی ہے؛ لوگوں کی اکثریت مادہ پرستی کے سیلاب میں بہہ کر مال و دولت اور شہرت و منصب کے حصول میں مگن ہے، ہر طرف عریانی و فحاشی کا بازار گرم ہے، حلال و حرام کے درمیان تمیز ختم ہوگئی ہے، خرید و فروخت اور تجارت کے معاملات میں دھوکہ اور حرام خوری عام ہے، خلافِ شریعت رسوم و رواجات زور پکڑ رہے ہیں، لوگ دین کے مقابلے میں دنیا کمانے کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے ذہنوں میں مذہب کی وقعت و اہمیت کم ہو رہی ہے اور نظریاتی و فکری لحاظ سے ان پر گمراہی کے اثرات شروع ہوگئے ہیں۔ تو ایسے میں ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ایک ایک قدم نہایت باریکی اور احتیاط کے ساتھ رکھ کر اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی پوری کوشش کرے اور ہر وقت ثواب و گناہ اور جائز و ناجائز کے بارے میں سوچے۔ اب تو حالت یہ ہوگئی ہے کہ کوئی گناہ کو گناہ بھی نہیں کہتا اور بیسیوں گناہوں کے ارتکاب کے باوجود یہ سوچتا بھی نہیں کہ وہ گناہ میں مشغول ہے، جبکہ کچھ لوگ

ایسے ہیں کہ گناہ کو ''معمولی بات'' کر کہہ ٹال دیتے ہیں حالانکہ اگر صحابہ کرام کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو وہ معمولی سے معمولی گناہ سے بھی بچنے کا اہتمام کرتے تھے، یہاں تک کہ مباحات اور لغو کاموں سے بھی بچتے تھے اور صرف وہ کام کرتے تھے جس میں ثواب ہو۔ حضورﷺ کے وصال کے بعد حضرت انس رضی اللہ عنہ لوگوں سے کہتے تھے کہ: ''تم لوگ گناہوں کے ایسے کام کرتے ہو جو تمھاری نگاہوں میں بال سے بھی زیادہ معمولی ہوتے ہیں، حالانکہ ہم اُسی کو حضورﷺ کے زمانے میں ہلاک کرنے والے گناہوں میں شمار کرتے تھے''۔ (بخاری) یعنی تم ان غلطیوں کو معمولی سمجھتے ہو جبکہ حضورﷺ کے زمانے میں تقویٰ اور احتیاط کا یہ عالَم تھا کہ اس قسم کی غلطیوں کو خطرناک اور تباہی کا باعث سمجھا جاتا تھا۔

مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ چھوٹی سی چھوٹی غلطی کو بھی اپنے لیے بہت بڑا نقصان اور خسارا سمجھے گا اور یہ اُس پر بڑا بوجھ ہوگا۔ جیسے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضورﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ:

> ''اِنَّ الْمُؤمِنَ یَرَی ذُنوبَه کَاَنَّهٗ قَاعِدٌ تَحْتَ جَبَلٍ یَخافُ اَنْ یَّقعَ عَلَیْهِ وَ اَنَّ الْفَاجِرَ یَرَی ذُنُوبَهٗ کَذُبَابٍ مَرَّ عَلی اَنْفِهٖ، فَقَالَ بِه هٰکَذا'' (بخاری) (مومن آدمی اپنے گناہوں کو ایسا دیکھتا ہے جیسے وہ کسی پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں وہ (پہاڑ) اس کے اوپر گر نہ جائے، اور فاجر (بدکار) آدمی اپنے گناہوں کو ایسا سمجھتا ہے جیسے کوئی مکھی اُس کی ناک کے پاس سے گزرے۔ اور اُس نے اپنے ہاتھ سے یوں اس طرف اشارہ کیا)۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مومن آدمی ہر وقت گناہ سے ڈرے گا اور وہ گناہوں کو ایسا بوجھ محسوس کرے گا جیسے اس کے اوپر کوئی پہاڑ گر کر اس کو ہلاک کرتا ہے۔ جبکہ فاسق و فاجر آدمی کے

دماغ اور ذہن میں گناہ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اگر اس سے گناہ ہوتا ہے تو اس کو اتنا معمولی دیکھتا ہے جیسے کوئی مکھی آ کر اس کی ناک کے پاس سے گزر جائے اور بات ختم۔

متقی اور پرہیزگار لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت چوکنے اور فکرمند رہتے ہیں۔ گناہ کرنا تو دور کی بات بلکہ اگر ان کے دل میں گناہ کا تصور بھی آ جائے تو یہ اُن کے لیے پریشانی کا باعث ہوتا ہے، اور وہ فوراً چونک کر استغفار کرتے ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں غیر متقین یعنی گنہگار لوگ گناہ پر گناہ کرتے ہیں لیکن ان کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی اور شیطان ان کو مزید گناہ میں دھکیل دیتا ہے۔ یہی مفہوم قرآن کی اس آیت میں موجود ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوا اِذَا مَسَّتُھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ. وَ اِخْوَانُھُمْ یَمُدُّوْنَھُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ﴾ (الاعراف: ۲۰۱، ۲۰۲) (جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا، انہیں شیطان کی طرف سے کوئی خیال آ کر چھوتا بھی ہے تو وہ (فوراً چوکنے ہو کر اللہ کو) یاد کر لیتے ہیں، چنانچہ ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور جو شیطان کے بھائی ہیں اُن کو یہ شیاطین گمراہی میں گھسیٹے لے جاتے ہیں، نتیجہ یہ کہ وہ (گمراہی سے) باز نہیں آتے)۔۔۔

کوئی صریح گناہ تو بہت بڑی بات ہے، تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہر بے فائدہ کام سے بھی اپنے آپ کو بچائے رکھے اور صرف وہ کام کرے جس میں آخرت کا فائدہ ہو۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

''مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ'' (ترمذی) کہ آدمی کے اسلام کی خوبی (اور اچھے مسلمان ہونے) میں یہ بھی ہے کہ وہ فضول (اور لغو) باتوں کو چھوڑ دے۔

اسی طرح تقویٰ میں یہ بھی داخل ہے کہ آدمی مشتبہات یعنی ہر اس کام سے بھی بچے جس میں گناہ اور ناجائز ہونے کا شک وشبہ ہو۔

الغرض تقویٰ کا تقاضا ہے کہ مسلمان اس دنیا میں رہتے ہوئے قدم قدم پر اپنے دل میں خوفِ خدا رکھے اور اپنے آپ کو گناہوں اور ناجائز کاموں سے بچائے رکھے۔ یہ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں بلکہ مرتے دم تک یہی احتیاط اور تقویٰ والی زندگی گزارنی ہے۔ نہ معلوم کس وقت موت آتی ہے اور انسان کس حالت میں موت کا سامنا کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۰۲) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمھیں موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو)

اس آیت کریمہ میں یہ بات واضح ہے کہ مسلمان کے دل میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کا خوف موجود رہنا چاہئے اور یہ خوف محض زبانی یا رسمی نہ ہو بلکہ بندہ جتنا کمزور ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات جتنی بڑی ہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور مطالبہ پر جس قدر عمل کی ضرورت ہے، اسی کے مطابق بندہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔ چونکہ موت کا کوئی وقت متعین نہیں اس لیے مسلمان ہر وقت یہ سوچے گا کہ ابھی مجھے موت آنے والی ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوکر اپنی زندگی کا حساب دینے والا ہوں۔ اس سوچ کے تحت وہ ہر وقت گناہوں سے دور رہنے کی کوشش کرے گا تاکہ اس کو ایسی حالت میں موت آئے کہ وہ گناہوں سے پاک، نیک اور متقی مسلمان ہو، تب جاکے وہ جنت کا مستحق قرار پائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى﴾ ترجمہ: (اور جو کوئی ڈرا ہوا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور روکا ہوا اس نے اپنے نفس کو خواہش سے، تو جنت ہی اس کا ٹھکانا

ہے)۔اس آیت شریفہ میں صاف بتایا گیا ہے کہ جنت جانے کے لیے روزِ محشر کی یاد اور اپنی خواہشات کو قربان کر کے شریعت کے احکامات کے مطابق زندگی گزارنا ضروری ہے۔

یاد رہے کہ نمازوں، روزوں، نوافل اور دیگر عبادات کی کثرت سے آدمی متقی اور تقوی دار نہیں بنتا بلکہ تقویٰ کے لیے شرط یہ ہے کہ آدمی گناہوں سے اجتناب کرے۔اگر کوئی ایک طرف بعض عبادات کی بجا آوری میں انتہا تک پہنچ جائے لیکن دوسری طرف اپنے آپ کو گناہوں سے نہیں بچاتا تو یہ کوئی کمال ہے اور نہ تقویٰ و پرہیز گاری۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک قول مشہور ہے کہ: ''تقویٰ دن کے روزوں، رات کی عبادات اور لوگوں میں خلط ملط ہونے کا نام نہیں بلکہ وہ دراصل اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ کاموں کو ترک کرنے اور اُس کے فرائض کو بجالانے کا نام ہے''۔حضورﷺ نے فرمایا:

> میں اپنی امت میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو قیامت کے دن تہامہ پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئیں گے۔اللہ تعالیٰ ان (نیکیوں) کو فضا میں اڑتے ہوئے ذرات کی طرح کردے گا (یعنی ضائع کردے گا)۔ ثوبان (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ان کا حال ہمیں بیان فرمادیں، ان کو واضح کردیں تاکہ ہم نہ جانتے ہوئے اُن میں سے نہ ہوجائیں۔حضورﷺ نے فرمایا: وہ تمھارے بھائیوں میں سے ہیں اور تمھاری قوم (یا چمڑے) میں سے ہیں۔وہ راتوں کو اس طرح عبادت کرتے ہیں جس طرح تم کرتے ہو لیکن وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو حرام کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ (ابن ماجه)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمان کو متقی اور پرہیز گار بننے کا حکم ہے اور یہی تقویٰ جنت میں جانے کا باعث ہے۔تقویٰ کا حق تب ادا ہوگا اور آدمی اس وقت متقی بنے گا جب وہ زندگی

کے ہر معاملے اور ہر ہر شعبے میں شریعت کی پیروی کرے اور دماغ سے جائز و ناجائز کا تصور نہ نکلنے دے۔ انسانی عبادات ہوں، معاملات ہوں، اخلاق ہوں، تجارت ہو یا معاشرتی زندگی ہو، غرض ہر مقام پر بندہ ناجائز اور گناہ والے کاموں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کی کوشش کرے۔ اپنے ہر ہر عمل اور سرگرمی کے بارے میں سوچے کہ یہ درست ہے یا غلط۔ اور چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے کام کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھے کہ شرعی اعتبار سے اس کام کی کیا حیثیت اور مقام ہے۔ جس طرح جسمانی لحاظ سے بیمار آدمی اپنے علاج کے لیے دوا استعمال کرتا ہے اور ڈاکٹر نے جن چیزوں کے کھانے سے منع کیا ہوتا ہے تو یہ مریض ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ہر اس چیز کے کھانے سے بچتا ہے جو اس کے لیے نقصان دہ ہو۔ اسی طرح ہر وہ عمل بھی نہیں کرتا جو اس کے مرض میں اضافے کا باعث ہو۔ یہ مریض کوئی بھی چیز کھانے سے پہلے سوچتا اور دیکھتا ہے کہ یہ میری صحت کے لیے مفید ہے یا مضر۔ اُس کو ہر وقت یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ کس طرح اس مرض سے نجات حاصل کر کے صحت یاب ہوجاؤں۔ بالکل اسی طرح مسلمان اپنی زندگی گزارے گا کہ کسی بھی وقت اُس سے ایسا عمل نہ ہوجائے جو اس کی روح کے لیے نقصان دہ ہو اور مرنے کے بعد اُس کے لیے خسارے اور عذاب کا باعث ہو۔

گناہ کب ہوتا ہے!!

نیکی پر آمادگی اور گناہوں سے بچنے کے لیے ہر وقت انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف موجود رہنا چاہئے۔ جب آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم رکھتا ہے؛ موت، قبر اور آخرت کے تذکرے کرتا ہے، جہنم کے ہولناک مناظر ذہن میں لاتا ہے تو پھر اس سے گناہ کے کام سرزد نہ ہوں گے۔ اگر کبھی غلطی یا معمولی غفلت سے کوئی گناہ ہو بھی جائے تو اُس کو فوراً توبہ کی توفیق نصیب ہوگی، لیکن جب انسان کی پوری توجہ دنیا اور دنیاوی امور پر ہوگی اور ایک لمحہ کے لیے

بھی اُس کے ذہن میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسول (ﷺ) اور موت وقبر کا تصور نہیں آتا تو وہ مکمل طور پر شیطان اور نفس کے شکنجے میں آکر گناہ ہی گناہ کرے گا اور نیکیوں سے دور رہے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کے دل ودماغ میں اللہ تعالیٰ کا استحضار ہو، موت اور حساب وکتاب یاد ہو اور پھر اُسی وقت وہ گناہ کے کاموں میں بھی مبتلا ہوجائے۔ اس لیے گناہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کے تصور سے غافل ہوجائے اور اس کے دل میں خوفِ خدا نہ رہے۔ علماء اور صوفیاء فرماتے ہیں کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو، قبر اور آخرت کے تذکرے کرو، اپنی گفتگو اور مجالس میں دین اور نیک اعمال زیر بحث لاؤ، تاکہ تمھارے دلوں میں غفلت پیدا نہ ہوجائے، کیونکہ غفلت کی وجہ سے آدمی گناہوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿وَ مَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ﴾ ترجمہ (اور جو شخص خدائے رحمٰن کے ذکر سے اندھا بن جائے، ہم اس پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہیں، جو اُس کا ساتھی بن جاتا ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ اپنے گناہوں پر توجہ نہ دینے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوکر زندگی گزارنے والے شخص پر شیطان مسلط ہوجاتا ہے جو اُس کو مزید گناہوں کی طرف لے جاتا ہے، اور پھر یہ شخص شیطان کا ساتھی بن جاتا ہے۔ جس کے بعد دین کے کاموں میں اُس کا دل نہیں لگتا بلکہ وہ گناہ کے کاموں میں زیادہ خوش اور مطمئن ہوتا ہے۔

اصل ذکر کیا ہے!

اللہ تعالیٰ کی یاد اور اصل ذکر یہ ہے کہ آدمی ہر وقت یہ سوچے کہ اس وقت اور اس کام کے دوران شریعت کا کونسا حکم میری طرف متوجہ ہے اور اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہے۔۔۔ انسان جب بھی کسی بھی نوعیت کا کوئی کام کرتا ہے تو وہ کام جائز ہوگا یا ناجائز۔ اس لیے آدمی اسی

وقت اس بات کا ادراک واحساس کرتے ہوئے جائز کام کرے اور ناجائز سے رُک جائے۔ مثلاً دیکھتا ہے تو سوچے کہ میرا یہ دیکھنا جائز ہے یا ناجائز یعنی میری نظر جس مقام پر پڑ رہی ہے، وہاں دیکھنا گناہ ہے، ثواب ہے یا مباح۔ اسی طرح کانوں سے سنتے اور زبان سے بولتے وقت سوچے کہ یہ کان اور زبان درست کام کے لیے استعمال ہو رہے ہیں یا غلط کام کے لیے۔ پھر اپنے پورے بدن کے بارے میں یہی سوچے اور کسی بھی کام کے وقت اللہ تعالیٰ کے احکامات، حضور ﷺ کے ارشادات اور شریعت کے مسائل کو قطعاً نہ بھولے۔ جب یہ تصور آدمی کے دماغ میں پختہ ہو جائے تو پھر کوئی بھی کام اور حرکت کرتے وقت اس کے لیے معیار دنیاوی نفع ونقصان یا عزت وذلت نہ ہوگا بلکہ گناہ وثواب اور جائز وناجائز اس کا معیار ٹھہرے گا۔

اعلانیہ گناہ کرنا

سچے مسلمان کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ گناہ کی طرف دیکھتا بھی نہیں اور نہ اس کے دل میں گناہ کا خیال آتا ہے لیکن پھر بھی انسان ہونے کے ناطے اگر شیطان اور نفس کے قابو میں آکر اس سے کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو وہ بہت شرم محسوس کرے گا اور اپنے گناہ پر سخت نادم ہوگا۔ لیکن آج زمانے میں اللہ تعالیٰ سے دوری اور دین سے غفلت کی اتنی انتہا ہوگئی ہے کہ گناہ کی اہمیت اور نقصان دل سے بالکل نکل گیا ہے؛ گناہ کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی اور نہ دل میں اس پر افسوس کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آدمی اعلانیہ اور کھلم کھلا گناہ کا کام کرتا ہے اور پھر بھی معاشرے میں دوسرے لوگوں کے درمیان ہنسی خوشی زندگی بسر کرتا ہے اور لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو ملامت بھی نہیں سمجھتا۔

حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ: **كُلُّ أُمَّتِي مُعَافىً اِلا الْمُجَاهِرُون** کہ میرا ہر امتی معاف ہوسکتا ہے لیکن اعلانیہ گناہ کرنے والے (یا اپنے گناہ کا اظہار کرنے والے) معاف

نہیں ہوں گے۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے گناہوں کو دوسرے لوگوں سے چھپاتے ہیں اور اس انداز سے گناہ کا کام کرتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی بات چھپ نہیں سکتی لیکن ایسے لوگ کم از کم اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے تو شرم محسوس کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو گناہ کا کام کرتے ہوئے نہ تو اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے ہیں اور نہ انسانوں سے شرماتے ہیں بلکہ سب کے سامنے اپنے گناہ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ اس عمل کو یا تو گناہ نہیں سمجھتے اور یا گناہ سمجھتے ہیں لیکن وہ اس گناہ کو حیثیت نہ دیکر اس پر غرور کرتے ہیں۔ داڑھی منڈانا، برسرِ عام رقص وسرور اور موسیقی کی محافل قائم کرنا اور ان میں شرکت کرنا، دورانِ نماز مسجد کے آس پاس فضول کھڑا رہنا، رشوت لینا، عورتوں کے ساتھ مخلوط مجالس کا انعقاد کرنا وغیرہ یہ سب اعلانیہ گناہوں میں شمار ہوتے ہیں۔

حدیث میں مذکور لفظ ''مجاھرون'' میں اپنے گناہوں کا اعلان کرنے والے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو گناہ تو خاموشی سے یا رات کو کر لیتے ہیں لیکن دن کو پھر دیگر لوگوں کے سامنے اپنے گناہ کے تذکرے کرتے ہیں کہ میں نے فلاں فلاں عمل کیا ہے۔ تو ایسے لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ انھیں معاف نہیں فرماتا۔

اعلانیہ گناہوں کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ ان کو دیکھ کر دیگر لوگ بھی وہ گناہ شروع کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ معاشرے اور لوگوں کے درمیان وہ عمل پھر معیوب یا گناہ والا شمار نہیں ہوتا۔ جو لوگ ایسے اعلانیہ اور کھلم کھلا گناہ کرنے پر شرم اور حیا محسوس نہیں کرتے تو وہ گناہ بھی اعتماد اور فخر سے کرتے ہیں پھر چونکہ وہ اس گناہ کو اہمیت نہیں دیتے، اس لیے اگر ان کو نصیحت بھی کی جائے تو وہ اپنے گناہ پر گویا فخریہ انداز اپناتے ہیں اور نصیحت کو ٹال دیتے ہیں۔ قرآن میں ایسے ہی ایک شخص کے بارے میں آیت آئی تھی کہ: وَ اذا قِیل لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتہُ العِزَّۃُ بِالاثمِ

فَحَسبُهُ جَهنّم، وَ بِئسَ المِهَاد ۔(اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر،تو آمادہ کرے اس کو غرور اور تکبر گناہ پر،سو کافی ہے اس کو دوزخ اور وہ بے شک برا ٹھکانا ہے) یعنی بجائے اس کے کہ ایسا آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اپنے گناہوں پر نادم ہوجائے،وہ اپنے گناہ پر غرور اور تکبر کا مظاہر کر کے باز نہیں آتا بلکہ اپنے گناہوں پر قائم رہتا ہے۔اگر غور کیا جائے تو موجودہ زمانے میں بھی کچھ اسی طرح کی صورتحال ہے؛لوگ برسرعام قسم قسم کے گناہ کرتے ہیں اور ان کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے ان کو اپنے گناہوں پر فخر اور غرور ہے۔دوسری طرف اگر ان کو وعظ ونصیحت کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی جائے تو وہ الٹا مذاق بناتے ہیں اور ماننے کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہوتے۔

گناہوں سے توبہ اور اس کا طریقہ

اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقویٰ اور گناہوں سے بچ کر زندگی گزارنے کا حکم ہے لیکن ہر وقت نفس اور شیطان کے مقابلے میں مبتلا انسان سے پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں غلطیاں اور گناہ کے کام ہوجاتے ہیں۔اگر کبھی غفلت اور لاپرواہی کی صورت میں مسلمان سے گناہ کا کام ہوجائے تو اُس کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ نے ''توبہ'' اور ''استغفار'' کا حکم دیا ہے۔اصلاحِ نفس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ آدمی اپنے گناہوں کا ادراک کر کے ان سے باز آجائے۔قرآن پاک اور احادیث میں جہاں ایک طرف توبہ اور استغفار کا حکم آیا ہے وہاں دوسری طرف توبہ کی بڑی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گناہ کے کرنے کے مقابلے میں اس گناہ پر قائم رہنا اور اس سے واپس لوٹ کر اپنی اصلاح نہ کرنا زیادہ بڑا جرم ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾(اللہ تعالیٰ کثرت

سے توبہ کرنے والوں اور خوب پاکی حاصل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

حضور ﷺ کا فرمان ہے: کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ (گناہوں سے توبہ کرنے والا اُس شخص جیسا ہے، جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو)۔ مشکوٰۃ شریف کی حدیث ہے کہ ''جب بندہ (اپنے گناہ کا) اعتراف کرتا ہے، پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرماتا ہے''۔

''توبہ'' کا مطلب ہے اپنے گناہوں پر نادم و پشیماں ہوکر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع (یعنی واپسی) کرنا اور اس سے مغفرت طلب کرنا۔ قرآن کریم کی متعدد آیات سے واضح ہے کہ جب بندہ صحیح معنوں میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دیتا ہے۔ جیسے ایک جگہ ارشاد ہے کہ ﴿۔۔۔اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوْبُ عَلَیْھِمْ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ﴾ (بقرہ:۱۶۰) ترجمہ: (۔۔۔مگر جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کام کو اور بیان کر دیا حق کو، تو میں ان کو معاف کرتا ہوں اور میں ہوں بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان)۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذَالِکَ وَ اَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (آل عمران:۸۹) (مگر جنہوں نے توبہ کی اس کے بعد، اور نیک کام کیے تو بیشک اللہ بخشنے والا رحیم ہے)۔

لیکن توبہ کا معاملہ اتنا آسان بھی نہیں ہے جتنا کہ سمجھا گیا ہے۔ یہ محض اتنی بات نہیں کہ آدمی کان پکڑ کر محض زبان سے رسمی انداز میں کہے کہ اللہ مجھے معاف فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ایسی توبہ قبول نہیں فرماتا کہ آدمی صبح و شام مسلسل گناہوں میں لگا رہے اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے بخشش اور مغفرت بھی طلب کرے۔ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے کہ: ﴿اے ایمان والو! اللہ کے حضور سچی توبہ کرو﴾ (التحریم:۸) دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر کبھی کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھتے ہیں یا (کسی اور طرح) اپنی جان پر ظلم کر گذرتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور

اس کے نتیجے میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کی معافی دے؟ اور یہ اپنے کیے (یعنی گناہوں) پر جان بوجھ کر اصرار (یعنی ہمیشگی) نہیں کرتے﴾ (آل عمران: ۱۳۵)۔ تیسری آیت ہے: ﴿اللہ نے توبہ قبول کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو نادانی سے کوئی برائی کر ڈالتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، چنانچہ اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے، اور اللہ ہر بات کو خوب جاننے والا بھی ہے، حکمت والا بھی﴾ (النساء: ۱۷)۔

توبہ کا طریقہ

مذکورہ بالا آخری تینوں آیات اور بعض احادیث کو یکجا کرنے سے جو مفہوم و مطلب نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سچی توبہ کا حکم دیا ہے جس کے بعد آدمی اپنے گناہوں پر قائم نہ رہے بلکہ ان پر نادم ہوکر چھوڑ دے۔ انہی آیات اور احادیث سے مفہوم لیکر توبہ کی قبولیت کے لیے تین شرائط بن جاتی ہیں: (۱) آدمی جس گناہ میں مبتلا ہو، اُس کو چھوڑ دے۔ (۲) اُس گناہ پر سخت نادم و پشیماں ہوکر اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرے۔ (۳) آئندہ کے لیے اُس گناہ کو نہ کرنے کا پکا عزم کرے۔ ایسی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوتی کہ آدمی سارا دن گناہوں میں گزار کر شام نوافل پڑھنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگے اور اگلے دن پھر وہی گناہ کے کام جاری رکھے، اور نہ ایسی توبہ مقبول ہے کہ آدمی قصداً و عمداً گناہ میں مبتلا رہے اور سوچے کہ پھر کبھی توبہ کروں گا۔ ایک حدیث اس طرح بھی منقول ہے کہ:

> ''معاذ بن جبلؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! التوبة النصوح (یعنی سچی توبہ) کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: کہ بندہ جو کرتا ہے اُس پر نادم ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر پیش کرے (یعنی معافی مانگے)، پھر اُس گناہ کی طرف واپس نہ لوٹے، جس طرح دودھ پستان کی طرف واپس

نہیں لوٹتا''۔

لہٰذا ایسی وقتی توبہ قبول نہیں ہوتی کہ آدمی اللہ کے سامنے روئے لیکن جس گناہ میں مبتلا ہو اُس کو چھوڑنے کی نیت نہ ہو۔ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''گناہ سے باز آئے بغیر توبہ کرنا جھوٹے لوگوں کی توبہ ہے''۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اب تک جس توبہ کا ذکر ہوا، یہ اُن گناہوں سے ہے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یعنی اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کے حقوق اور احکامات کی خلاف ورزی کی ہو تو اس کے لیے توبہ کا انداز یہ ہے لیکن جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنے یا ندامت و پشیمانی سے معاف نہیں ہوتے، اسی طرح حقوق اللہ اور عبادات میں سے بھی جو فرائض ہیں اگر ان میں بھی کوتاہی کی گئی ہو تو وہ بھی توبہ سے معاف نہیں ہوتے بلکہ ان کی قضا اور اعادہ ضروری ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے سوال کیا کہ توبہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جو جواب دیا وہ آسان الفاظ میں یہ ہے کہ توبہ وہ ہے جس میں چھے چیزیں جمع ہوں: (۱) اپنے گذشتہ برے عمل پر ندامت۔ (۲) جو فرائض (اور واجبات) اللہ تعالیٰ کے رہ گئے ہیں، اُن کی قضا۔ (۳) کسی کا مال وغیرہ ظلماً لیا تھا، تو اُس کی واپسی۔ (۴) کسی کو ہاتھ یا زبان سے ستایا اور تکلیف پہنچائی گئی تھی تو اس (شخص) سے معافی۔ (۵) آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا پختہ عزم و ارادہ۔ (۶) اور یہ کہ جس طرح اُس نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا ہے، اب وہ اطاعت کرتے ہوئے دیکھ لے (منقول بحوالہ تفسیر مظہری)۔ اس سے معلوم ہوا کہ توبہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کے باوجود جو فرائض رہ گئے ہیں اُن کی قضا اور ادائیگی ضروری ہے، جیسے کسی سے نمازیں رہ گئی ہوں تو اُن کی قضا ضروری ہے۔ زکوٰۃ ادا نہ کی ہو تو اب دینا لازم ہے، عورتوں کو میراث میں حق نہ دیا ہو تو اب ادائیگی واجب ہے۔ وغیرہ۔ توبہ کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ساری چیزیں ایسی ہی معاف ہوگئیں۔ اسی طرح حقوق العباد بھی توبہ سے

معاف نہیں ہوتے؛ اگر کسی کا مال لیا ہے، چوری کی ہے یا ایسا ظلم کیا ہے جس کی تلافی اور واپسی کسی چیز کی شکل میں ممکن ہو تو وہ واپسی لازم ہے اور اگر کسی کو ہاتھ یا زبان سے تکلیف دی ہے؛ جیسے گالی، تہمت، بے عزتی، مارنا وغیرہ تو اُس شخص سے معافی مانگے، اور معافی بھی اس انداز سے ہو کہ وہ شخص واقعی اس کو معاف کرے۔ خلاصہ یہ کہ اگر گناہ کا تعلق کسی دوسرے بندہ کے حق سے ہو تو کسی بھی طریقہ سے اُس کو راضی کر کے معافی مانگے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

> ''اللہ تعالیٰ ایسے بندے پر رحم کرے جس کے پاس اس کے بھائی کی عزت یا مال میں کوئی بدلہ ہو، پھر وہ مرنے سے پہلے ہی اس کے پاس آ کے دنیا ہی میں اس سے معاف کرالے، کیونکہ قیامت کے روز نہ تو اس کے پاس دینار ہوگا اور نہ ہی درہم۔ پھر اگر ظالم کے پاس کچھ نیکیاں ہوں گی تو اس کی نیکیوں سے بدلہ لیا جائے گا اور اگر اس کے پاس نیکیاں بھی نہ ہوں گی تو مظلوموں کے گناہ ظالم کے سر پر ڈال دیے جائیں گے''۔ (ترمذی)

تو ضروری ہے کہ اگر کسی کے اوپر دوسرے بندے کا حق ہو تو اُس کو دنیا ہی میں معاف کرالے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ: ''اعمال نامے تین قسم کے ہیں؛ ایک اعمال نامہ وہ ہوگا کہ جس سے اللہ تعالیٰ کچھ معاف نہیں کرے گا، ایک اعمال نامہ وہ ہوگا جس کی اللہ تعالیٰ کچھ پروا نہیں کرے گا اور ایک اعمال نامہ وہ ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ کچھ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اعمال نامہ جس سے اللہ تعالیٰ کچھ معاف نہیں کرے گا، تو وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اللہ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرا لیا جائے اور اس کے علاوہ گناہوں کو معاف کرتا ہے، جس کو چاہے'' اور وہ اعمال نامہ جس کی اللہ تعالیٰ کچھ بھی پروا نہیں کرتا وہ بندے کا اپنے اوپر ان معاملات میں ظلم کرنا ہے جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہیں (یعنی حقوق اللہ

میں کوتاہی) کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اپنا حق معاف فرمائے گا۔ اور وہ اعمال نامہ جس سے اللہ تعالیٰ کچھ بھی نہیں چھوڑے گا تو وہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی ہے، جن کے درمیان ضرور قصاص ہوگا (یعنی اُن مظالم اور زیادتیوں کے بارے میں ضرور باز پرس ہوگی)۔ (منقول بحوالہ المستدرك للحاكم)

بہرحال اپنے نفس کی اصلاح کے لیے گذشتہ گناہوں سے توبہ ضروری ہے۔ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہر وقت اپنے بارے میں سوچے اور گناہوں کا احساس کرے۔ جہاں بھی اس سے کوئی کوتاہی اور غفلت ہوجائے تو فوراً توبہ کرکے دنیا ہی میں اُن گناہوں کی تلافی کرے۔ مسلمان کو ہر وقت توبہ واستغفار کرنا چاہئے، یہاں تک کہ اس توبہ کی وجہ سے اس کے دل میں سکون اور خوشی محسوس ہوجائے اور وہ اپنے اوپر توبہ کے اثرات محسوس بھی کرے۔ مکاشفۃ القلوب میں ہے کہ ''کسی عالم سے سوال پوچھا گیا: جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اسے اپنی توبہ کی قبولیت یا غیر قبول ہونے کا پتہ چل جاتا ہے؟ عالم نے جواب دیا، ہاں! کچھ ایسی نشانیاں ہیں جن سے توبہ کی قبولیت کے بارے میں معلوم ہوجاتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اسے گناہوں سے پاک رکھتا ہے، اس کے دل سے خوشی کافور ہوجاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو ہر آن موجود سمجھنا شروع کرتا ہے، دنیا کی تھوڑی سی نعمت کو بھی عظیم اور آخرت کے لیے اپنی کثیر نیکیوں کو بھی بہت کم خیال کرتا ہے۔ اپنے دل کو ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول اور اپنی زبان کو (فضول گوئی سے) بند رکھتا ہے۔ اپنے سابقہ گناہوں پر غور وفکر کرتے ہوئے ہمیشہ نادم رہتا ہے اور اپنے لیے غم اور پریشانی کو لازم کرلیتا ہے''۔

نیکی کے مقابلے میں گناہوں سے بچنے کا اہتمام

اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا کام یہی ہوتا ہے کہ فرائض واحکامات پر عمل کے علاوہ بھی زیادہ سے زیادہ ثواب اور نیکیاں کمانے کی فکر میں ہوتے ہیں اور کسی طریقے سے ایسے مواقع

تلاش کرتے ہیں جن سے ان کی نیکیوں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات میں اضافہ ہوجائے۔ اس کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ نوافل ادا کرتے ہیں۔ راتوں کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں۔ روزانہ کئی کئی پارے تلاوت کرتے ہیں۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ صدقات دیتے ہیں۔ دیگر انسانوں کو نفع پہنچاتے ہیں اور ان کی زندگی کا اکثر حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اللہ تعالیٰ ہی سے تعلق میں گزرتا ہے۔ چونکہ آج کے زمانے میں لوگوں کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔ ہر کوئی صبح سے شام تک دنیاوی مشاغل میں لگا رہتا ہے اور وقت وحالات کے مطابق ہر شخص کے اوپر کچھ نہ کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہیں۔ ایسے میں یہ بھی غنیمت ہے کہ آدمی اگر اضافی نیکیاں کرنے اور ثواب کمانے کا موقع نہ پائے لیکن فرائض واحکامات پر عمل کرے اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے رکھے۔ ایسا آدمی یقیناً آج کے دور میں ولی اللہ ہوگا جو کم ازکم گناہ نہ کرے اور حتی الامکان تقویٰ والی زندگی بسر کرے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ ذکر کیا جاتا ہے کہ کسی بزرگ اور نیک آدمی کے پاس ایک مرید جا کر ٹھہر گیا۔ کچھ عرصہ بعد مرید نے کہا کہ: حضرت! میں اتنا عرصہ آپ کے پاس رہا لیکن میں نے آپ کے ہاں کچھ نیا نہیں دیکھا۔ مرید کا مطلب یہ تھا کہ آپ عبادات زیادہ نہیں کرتے اور ہر وقت اضافی نیک اعمال میں مصروف نہیں رہتے۔ تو بزرگ نے اپنے مرید سے پوچھا کہ تم جتنا عرصہ میرے پاس رہے ہو، اتنے وقت میں تم نے مجھ سے کوئی گناہ کا کام دیکھا ہے؟ یا کسی عمل میں مجھ سے شریعت کی خلاف ورزی ہوئی ہے؟ مرید نے جواب دیا کہ ایسا تو نہیں دیکھا۔ بزرگ نے فرمایا کہ یہی اصل عبادت ہے اور یہی کمال ہے کہ آدمی بیشک نیکیاں کم کرے لیکن گناہوں سے بچے اور نافرمانی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو ناراض نہ کرے۔

تو کوشش یہ کرنی چاہئے کہ آدمی اسلامی احکامات بجالائے۔ اپنے دنیاوی کاموں اور مشاغل میں مصروف رہے لیکن اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا بہرصورت ممکن بنائے۔

اصل امتحان (دنیا، نفس اور خواہشات سے مقابلہ)

ایمان کی مضبوطی اور مذہب سے لگاؤ کا اصل اندازہ اُس وقت ہوتا ہے جب کسی شرعی حکم اور دنیاوی مفاد کے درمیان ٹکراؤ آجائے۔ اسی طرح جب اسلام کا حکم کچھ ہو اور نفس کی خواہش اس سے مختلف ہو، تب پتہ چلے گا کہ آدمی شریعت کے حکم کو مقدم کرتا ہے یا اپنی خواہش اور دنیاوی مفاد کے مطابق عمل کرتا ہے۔ جن اعمال میں کوئی دنیاوی نقصان نہ ہو یا انسانی خواہش کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو، وہاں تو بندہ خوشی خوشی عمل کرتا ہے لیکن جس مقام پر قربانی دینی پڑتی ہو، اپنی خواہش کو چھوڑنا پڑتا ہو یا کسی دنیاوی فائدہ کو ترک کرنا پڑے تو وہاں پر دین و مذہب اس کو یاد نہیں رہتا۔ جیسے ہماری شادی غمی اور دیگر معاشرتی رسوم و رواجات عموماً قرآن و حدیث کے خلاف ہوتے ہیں لیکن عوام میں اتنے رائج اور پختہ ہوگئے ہیں کہ نہ کرنے پر ملامت ہوتی ہے۔ اب یہاں امتحان ہے کہ آدمی قرآن وسنت کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے یا ''عوامی دباؤ'' سے مجبور ہوکر خلاف شریعت رسم کو اختیار کرتا ہے۔ نماز کے وقت اپنی دکان اور کاروبار بند کرتا ہے یا نہیں۔۔ اپنے مال سے زکوٰۃ اور صدقات دیتا ہے یا نہیں۔۔ عورتوں کو میراث میں حق دیتا ہے یا نہیں۔۔۔ حرام آمدنی سے بچتا ہے یا نہیں۔۔ کسی رشتہ دار اور پرائے کے درمیان تنازع اور اختلاف ہو تو وہاں حق بات کرتا ہے یا اپنے خاندان والوں کے ساتھ ناحق پر کھڑا رہتا ہے۔۔ سخت سردی میں صبح اٹھ کر وضو بناتا ہے یا نہیں۔۔ تجارت اور خرید وفروخت کے سلسلہ میں آدمی کے لیے بڑا امتحان ہوتا ہے کہ وہ جائز کاروبار کرکے کم کماتا ہے یا دھوکہ، فراڈ، چوری، ملاوٹ، جھوٹ اور دیگر حرام وناجائز ذرائع سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتا ہے، وغیرہ۔

اس عنوان کے تحت اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانا بھی داخل ہے؛ ظاہر ہے انسان سے گناہ کے کام ہوجانے میں اس کی نفسانی خواہشات کا بہت بڑا دخل ہے۔ انسان کی طبیعت

اور مزاج میں داخل ہے کہ وہ بہت کچھ کی خواہش رکھتا ہے لیکن شریعت کی طرف سے ہر خواہش کو پورا کرنے کی اجازت نہیں اور یہی انسان کے لیے امتحان ہے۔ کسی بھی طریقے سے زیادہ مال جمع کرنے کی خواہش، نام ونمود اور شہرت کی خواہش، بے حیائی اور فحاشی کے کاموں کی خواہش، بڑے بڑے عہدے حاصل کرنے کی خواہش، زیادہ سے زیادہ لذت اور راحتیں پانے کی خواہش، شراب پینے کی خواہش، موسیقی اور غلط چیزیں سننے کی خواہش، شادی غمی اپنے مزاج کے مطابق سرانجام دینے کی خواہش، بڑے بڑے محلات اور فخر وغرور والے مکانات بنانے کی خواہش۔ الغرض کتنی خواہشات ہیں جو ہر شخص کے دل میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان تمام خواہشات میں شریعت کی طرف سے حدود مقرر ہیں اور کہیں بھی اپنی مرضی کے مطابق خواہش پوری نہیں کی جاسکتی۔ بعض صوفیاء اور بزرگوں کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے اتنی احتیاط سے کام لیتے تھے کہ بعض دفعہ کھانے پینے اور دیگر کاموں میں اپنی کسی جائز خواہش کو بھی پورا نہیں کرتے تھے۔ ان کو ڈر ہوتا تھا کہ اگر آج ہم اپنے دل اور خواہش کے مطابق کوئی جائز اور مباح کام بھی کریں تو ہوسکتا ہے کل کو ہم اپنے نفس کی ناجائز خواہش پوری کرنے کی طرف بھی مائل ہوجائیں۔ مثلاً حضرت سری سقطی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ میرے نفس کو چالیس سال سے یہ خواہش ہے کہ میں اخروٹ کو شہد میں ڈبو کر کھاؤں لیکن میں نے اپنے نفس کے ساتھ مقابلے کے طور پر اپنی یہ خواہش پوری نہیں کی (حالانکہ شہد اور اخروٹ کو ایک ساتھ کھانا کوئی ناجائز کام نہیں)۔ اسی طرح حضرت ابراہیم خواص رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کو آنار کھانے کی خواہش ہوتی تھی تو انہوں نے ایک اور بزرگ کے ذریعے دعا کروائی تھی کہ میری یہ خواہش ختم ہوجائے، اس لیے کہ ان خواہشات پوری کرنے کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کے دل میں موت کے قریب خواہش پیدا ہوئی کہ شہد اور دودھ میں گرم روٹی ملا کر کھاؤں۔ خادم نے آپ کے لیے یہ کھانا تیار

کر کے پیش کر دیا۔ آپ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتے رہے اور پھر فرمایا کہ اے نفس! تو نے تیس برس تک مسلسل صبر کیا، اب اپنی عمر کے اس آخری لمحے میں تجھ سے صبر نہیں ہوسکتا؟ یہ فرماتے ہوئے آپ نے وہ کھانا واپس کر دیا اور یہی پر ان کا وصال ہوگیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک قول کا مفہوم ہے کہ میں اپنے نفس کے ساتھ مقابلے میں ایسا ہوں جیسے ایک چرواہا بکریوں کے ریوڑ کو قابو کرتا ہے، جب وہ بکریاں ایک طرف سے اکٹھا کرتا ہے تو وہ دوسری طرف سے نکل جاتی ہیں۔ امام غزالی رحمہ اللہ کیمیائے سعادت میں فرماتے ہیں کہ ''جب انسانی نفس مباح (اور جائز) چیزوں سے مزہ پاتا ہے تو (آہستہ آہستہ اُس کے دل میں) دنیا کی محبت شروع ہوجاتی ہے، اور دل اس میں اٹک جاتا ہے۔۔۔ اگر آدمی جائز اور مباح خواہشات سے بھی اپنے آپ کو روکے تو اس سے نفس قابو میں آجاتا ہے اور دنیا سے نفرت ہونے لگتی ہے۔۔۔ اپنی خواہش کو قابو کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی جس چیز سے بہت خوش ہوتا ہے، اسے چھوڑ دے اور جو چیز اُس پر غالب ہو، اس کے خلاف عمل کرے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ''حرام میں مبتلا ہونے کے خوف سے میں ستر بار حلال سے (بھی) ہاتھ کھینچتا ہوں''۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو یہ فکر بھی لاحق ہوتی ہے کہ اگر ہم نے جائز چیزوں میں بھی اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں نہ رکھا تو ہوسکتا ہے کہ کل کو اس نفس میں کسی ناجائز کام کی خواہش بھی پیدا ہوجائے۔

تو آدمی کا اصل امتحان یہی ہے کہ وہ اپنے نفس کے ساتھ مقابلہ کرے اور اپنے نفس کی خواہش کے لیے کبھی دینی حکم کو قربان نہ کرے اور نہ کسی شوق کی تکمیل کے لیے کوئی حرام کام کرے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک اور جنتی لوگوں کے اوصاف میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ (جس نے نفس کو خواہش سے روکا) (النازعات: ۴۰)۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ ''مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس سے

جہاد کرتا ہے اور مہاجر وہ ہے جو خطائیں اور گناہ چھوڑ دے''۔ اللہ کے نیک بندے دنیا میں کبھی اپنی خواہشات کی تکمیل نہیں چاہتے بلکہ وہ دنیا میں مشکلات والی زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں کیونکہ دنیاوی راحتیں اخروی لحاظ سے نقصان اور یہاں کی پریشانیاں آخرت کے لحاظ سے فائدہ کی باعث ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''جتنا کسی کو دنیا میں سے کچھ ملتا ہے، اتنا ہی اس کا مقام اللہ کے نزدیک گھٹ جاتا ہے، اگرچہ وہ اللہ کے نزدیک کچھ مرتبہ و مقام بھی رکھتا ہو''۔

تو نفس کے ساتھ مقابلہ کر کے اس کی تمام خواہشات کو قابو کرنا ہے۔ قابو کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام ناجائز خواہشات ختم ہوجائیں اور صرف وہی خواہش دل و نفس میں باقی رہے جو شریعت کے مطابق ہو اور آدمی اسی کے موافق عمل کرے۔ جیسے ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

''تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا، یہاں تک کہ اس کی خواہشات میرے لائے ہوئے دین کے تابع نہ ہوجائیں''۔

خود حسابی اور نفس کے علاج کی فکر

مسلمان پر لازم ہے کہ سب سے پہلے وہ اپنی روحانی اور نفسانی بیماریوں یعنی شرعی عیوب کا احساس و ادراک کرے۔ اگر اس کو خود پتہ نہیں چلتا تو کسی با اعتماد اور ماہر عالم دین کے پاس جا کر اُس کے سامنے اپنی پوری زندگی رکھے کہ صبح سے شام تک اس کی زندگی گزارنے کا انداز کیا ہے۔ اپنی عبادات، معاملات، معاشرات اور اخلاق وغیرہ اس کے سامنے بیان کر کے ٹھیک اور غلط کے بارے میں دریافت کرے۔ اس بات کا تعین کروائے کہ اس کی زندگی میں جائز امور کتنے ہیں اور ناجائز و حرام کام کتنے اور کون کون سے ہیں۔ اس تشخیص کے بعد پھر اس عالم دین سے رہنمائی لے اور اُسی کے مطابق اپنی بقایا زندگی گزارے۔ چونکہ شیطان اور نفسانی

خواہشات انسان کی سب سے بڑی دشمن ہیں اس لیے مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہر وقت اپنے نفس کے علاج کی فکر میں ہو اور ایک لمحہ بھی اس سے غافل نہ رہے۔ جس طرح انسان اپنا جسمانی علاج اُس وقت کراتا ہے جب اس کو پتہ چلے بلکہ اب تو لوگ کسی مرض کے ظاہر ہونے سے پہلے پہلے مختلف ٹیسٹ اور چیک اپ کے ذریعہ دیکھتے ہیں کہ آیا میرے بدن میں کوئی چھپی بیماری موجود تو نہیں۔ اسی طرح مسلمان اپنے آپ کو جانوروں اور دیگر حیوانات کی طرح آزاد نہ سمجھے بلکہ ہر وقت اپنے گناہوں کا ادراک کرے کہ میں کن کن گناہوں میں مبتلا ہوں۔ میرے اندر کون کون سے شرعی عیوب موجود ہیں، میں کہاں کہاں ناجائز کام کرتا ہوں اور میری زندگی کا وہ کون سا عمل ہے جو قرآن وسنت کے خلاف جا رہا ہے۔ جہاں بھی کوئی غلطی نظر آئے تو فوراً توبہ کر کے اس سے باز آجائے۔ روایات میں آتا ہے کہ:

> ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی اور خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو دین کی سمجھ عطا کرتا ہے، دنیا میں زہد (اور بے رغبتی) عنایت کرتا ہے اور اسے اپنے عیوب (گناہ) دکھلاتا ہے (یعنی گناہوں کا ادراک کرواتا ہے)۔ پس جس کو یہ چیزیں دی گئیں تو اس کو دنیا اور آخرت کی بھلائی دی گئی''۔

بعض بزرگوں نے اپنے عیوب معلوم کرنے کے طریقے بھی بتلائے ہیں: فرماتے ہیں کہ آدمی اپنے عیب کو چار طریقوں سے جان سکتا ہے؛ ایک تو یہ کہ مرشد کامل یعنی نیک آدمی کی خدمت میں بیٹھے تاکہ وہ اس کے عیوب دیکھ کر اسے بتلا سکے۔۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ کسی نیک اور دین سے واقف دوست کو اپنا نگہبان بنائے اور وہ (دوست) اس کے عیب چھپائے نہیں بلکہ جو حقیقت ہو وہی اس کے سامنے بیان کرے۔۔۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے حق میں دشمن کی بات سنے کیونکہ اس (دشمن) کی نظر ہمیشہ عیب پر جاتی ہے۔۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں پر نظر رکھے، جس میں جو عیب نظر آئے اس سے خود بچے اور اپنے اوپر یہ گمان کرے کہ میں

بھی ایسا ہی ہوں۔(کیمیائے سعادت)۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہر وقت اپنے نفس اور اس کے علاج کی فکر رہتی تھی۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حضور ﷺ نے منافقوں کے بھید (اور علامات) تم سے ذکر کیے تھے، تم نے میرے اندر منافقت کی کونسی نشانی دیکھی؟۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے عظیم الشان صحابی کو بھی اپنے عیوب اور کوتاہیوں کے بارے میں اتنی فکر تھی کہ وہ دوسرے صحابی سے پوچھ کر اپنے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہے۔یہ تقویٰ اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام تھا جو صحابہ کرام کیا کرتے تھے۔علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ عقلمند آدمی اپنے بارے میں ہمیشہ بدگمان رہتا ہے اور وہ ہر وقت اپنے اندر گناہ اور کوتاہی تلاش کرتا ہے تاکہ اس کو معلوم کر کے اصلاح کر سکے۔پہلے بتایا گیا کہ اگر کسی کو خود اپنے گناہوں کا ادراک نہ ہو تو کسی ماہر عالم دین سے پوچھ کر معلوم کر لے۔اسی کو خود حسابی کہتے ہیں کہ جس طرح آدمی دنیاوی لحاظ سے ہر وقت اپنے بارے میں سوچتا رہتا ہے کہ میں کتنا کامیاب ہوں اور کتنا ناکام۔بالکل اسی طرح روزانہ اُخروی لحاظ سے بھی خود اپنے ساتھ حساب کرے گا کہ میں نے آج ثواب کے کتنے کام کیے اور کس کس جگہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔ہر رات سونے سے قبل آدمی کو پورے دن کے اعمال پر نظر ڈالنی چاہئے کہ آج میں نے شریعت کے احکام پر کتنا عمل کیا اور کتنا وقت ناجائز کاموں میں گزارا۔ترمذی شریف کی ایک روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:

''حَاسِبُوا اَنْفُسَكُم قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوا وَ تَزَيَّنُوا لِلْعَرضِ الْاَكْبَرِ وَ اِنَّمَا يَخِفُّ الْحِسَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلىٰ مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهٗ فِي الدُّنْيَا''۔ترجمہ:(اپنے نفس کا (خود) محاسبہ کرو، قبل اس کے کہ تمھارا محاسبہ کیا جائے اور (آخرت کی) بڑی پیشی کے لیے تدبیر (اور تیاری)

کرو، اور جو شخص دنیا ہی میں اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے، قیامت کے روز اس پر حساب آسان ہوگا)۔

مومن آدمی ہر وقت اس فکر میں مبتلا ہوگا کہ میں نے آخرت اور قبر کے لیے کتنی تیاری کر رکھی ہے۔ اگر اسی حالت میں مجھے موت آجائے تو آیا میں حساب دینے کے لیے تیار ہوں!! لہٰذا ہر وقت خود اپنے اعمال پر نظر رکھ کر آخرت کی تیاری کرنی چاہئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰه خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾(الحشر: ۱۸)۔ ترجمہ: (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ یقین رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے)۔

اس آیت میں جہاں تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی تاکید ہے وہاں اہم بات یہ مذکور ہے کہ ہر انسان اپنے بارے میں یہ دیکھے کہ وہ مرنے کے بعد والی زندگی کے لیے کیا تیاری کر رہا ہے اور کیا اس کے اعمال اس لائق ہیں کہ وہ موجودہ حالت میں اللہ کے سامنے پیش ہو سکے۔ ایک اور آیت میں ہے کہ قیامت کی سختی دیکھ کر گنہگار لوگ کہیں گے کہ: ﴿ يٰـلَيْتَنِـي قَـدَّمْـتُ لِـحَيَـا تِـي ﴾ (کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ آگے بھیج دیا ہوتا) (الفجر: ۲٤)۔ یعنی میں نے دنیا میں گناہوں کے مقابلے میں آخرت کی زندگی کے لیے نیک اعمال کا ذخیرہ جمع کیا ہوتا تو آج میرے کام آتا۔

کامیاب اور ہوشیار کون ہے؟

کامیاب لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں؛ ایک دنیاوی لحاظ سے کامیاب اور دوسرے اُخروی لحاظ سے کامیاب۔ دنیاوی لحاظ سے وہ لوگ کامیاب مانے جاتے ہیں جن کے پاس مال

و دولت ہو، بڑی بڑی جاگیریں ہوں، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں، اولاد کی کثرت ہو اور معاشرے میں بڑا نام اور شہرت ہو، وغیرہ جبکہ آخرت کے لحاظ سے کامیاب لوگ وہ ہیں جو اپنی پوری زندگی شریعت مطہرہ کے مطابق گزار کر جنت کے مستحق قرار پائیں۔ آج ہر لحاظ سے لوگوں کے معیارات بدل گئے ہیں۔ اکثریت دنیاوی کامیابی کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ ''کامیاب'' کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو دنیاوی لحاظ سے کامیاب ہوں حالانکہ جس طرح یہ دنیا عارضی ہے اس طرح اس دنیا کی کامیابی بھی عارضی ہے۔۔۔۔ ایک آدمی دنیاوی لحاظ سے جتنا کامیاب بنتا ہے اُتنا ہی وہ اخروی لحاظ سے خطرے میں پڑ جاتا ہے، کیونکہ اس دنیا کی ہر خوشی اور ترقی آخرت میں حساب و کتاب اور وبال و نقصان کا باعث بن سکتی ہے اور اس کے مقابلے میں دنیا کی تکالیف، مصائب اور پریشانیاں آخرت میں خوشی اور اجر کی باعث بنیں گی۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیاوی کامیابی کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں ہے۔ اُس کے ہاں فقط آخرت کی کامیابی مطلوب ہے جس کے لیے تیاری اسی دنیا میں کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جہاں بھی فلاح، نجات اور کامیابی کے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں تو یہ ان لوگوں کے لیے ہیں جو اپنی زندگی تقویٰ کے تحت اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حضور ﷺ کی تعلیمات کی پیروی میں گزارتے ہیں، بھلے یہ لوگ دنیاوی لحاظ سے کتنے ہی کمزور اور ناکام کیوں نہ ہوں۔ بس سیدھے الفاظ میں کامیاب آدمی وہ ہے، جس کا ذکر اس قرآنی آیت میں ہے کہ:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (آل عمران: ۱۸۵) ترجمہ: (جس کو دوزخ سے دور کیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہوگیا)۔

ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ (الاعلیٰ: ۱۴) ترجمہ: (بے شک اس نے فلاح (کامیابی) پائی جس نے پاکیزگی اختیار کی)۔ یعنی وہ شخص کامیاب ہے جس

نے صحیح عقیدہ اختیار کر کے نیک اعمال کیے اور اپنے آپ کو ہر قسم کے ظاہری اور باطنی گناہوں سے پاک رکھا۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْماً﴾ ترجمہ: (اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے بڑی کامیابی پائی)۔

انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ دنیاوی لحاظ سے وہ جیسا بھی ہو لیکن یہاں رہ کر ہر وہ عمل کرے جو آخرت کے اعتبار سے کامیابی کا باعث ہو اور اُس کی بنیاد پر وہ جہنم کی آگ سے بچ کر جنت میں داخل ہوجائے۔ آج اس عارضی اور فانی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے لوگ طرح طرح کے منصوبے بناتے ہیں۔ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ کس طرح مال و دولت، شہرت اور اعلیٰ عہدے حاصل کریں لیکن آخرت کی حقیقی کامیابی کے لیے نہ کوئی تگ و دو ہے اور نہ کوئی لائحہ عمل اور محنت نظر آتی ہے۔ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے والا شخص دیگر لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوشیار بھی قرار پاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ بڑا بے وقوف اور کم عقل ہوتا ہے، اس لیے کہ اُس کی ''عقل'' دنیا کمانے کے لیے تو استعمال ہوتی ہے لیکن مرنے کے بعد اتنے خطرناک مراحل اور پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر حساب دینے جیسی چیزوں سے اُس کی آنکھیں بند ہیں اور عقل پر پردے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سورہ عصر میں کامیابی اور ناکامی کا ایک اور واضح معیار بھی متعین فرما دیا ہے: ﴿وَالْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِی خُسْرٍ، اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ ترجمہ: (زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے (اور نقصان) میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں)۔ تین آیات پر مشتمل اس سورت میں بالکل صراحت کے ساتھ یہی مذکور ہے کہ دنیا میں ایمان و عمل سے محروم تمام لوگ نقصان اور سراسر خسارے میں ہیں، چاہے دنیاوی لحاظ سے وہ جتنے بھی کامیاب شمار ہوتے ہوں اور جس بھی شعبے سے وابستہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں

صرف وہ لوگ آخرت کے اعتبار سے کامیاب اور نقصان سے بچے ہوئے ہیں جوان چار صفات کے حامل ہوں؛ (۱) سب سے پہلے ایمان لائے۔ (۲) پھر صرف ایمان کو کافی نہ سمجھا بلکہ اپنی زندگی شریعت کے مطابق گزار کر نیک اعمال کیے۔ (۳) اس کے بعد صرف خود نیک بن کر عمل نہ کیا بلکہ دوسروں کو بھی حق بات اور نیکی کی وصیت وتلقین کرتے رہے۔ (۴) ظاہر ہے ہر طرف سے مادہ پرستی اور دنیا پرستی کے ماحول میں دین پر خود چلنے اور دوسروں کو تلقین کرنے سے آدمی کو طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں گی۔ ایک طرف اپنے نفس اور خواہشات کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوتا ہے اور دوسری طرف ماحول اور معاشرہ کی طرف سے آنے والی رکاوٹیں اور تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ تو ایسی حالت میں یہ دیندار لوگ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے اور صبر کی وصیت وتاکید کرتے رہے۔ اس سورت میں دنیاوی مال ودولت، منصب وعہدہ، شہرت وبڑائی اور دیگر تمام چیزوں کے مقابلے میں کامیابی کا معیار مذکورہ چار باتوں پر رکھا گیا۔

درحقیقت ہوشیار اور دانا آدمی وہ ہے جو اس دنیا میں جیسے بھی ہو فقط وقت گزارے لیکن پوری محنت اور کوشش مرنے کے بعد والی ابدی زندگی کے لیے کرے؛ جیسے ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

> " اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَ عَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَ الْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ " (عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کو عاجز بنادے (یعنی گناہوں سے قابو میں رکھ کر احکام الٰہی کا تابع بنادے) اور موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل کرے۔ اور کم عقل شخص وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اس کی خواہش کے تابع کیا اور اللہ پر امید باندھ لی (کہ وہ غفور ورحیم ہے))۔ ترمذی

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عمل، طلب اور گناہوں سے بچنے کے بغیر اللہ تعالیٰ سے رحمت

کی امید رکھنا حماقت ہے۔ سمجھدار لوگ وہ ہیں جو اس مختصر زندگی کی راحتوں اور خوشیوں کے مقابلے میں آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک حدیث اس طرح بھی منقول ہے کہ: ''اَعْقَلُ النَّاسِ أتْرَکُھم لِلدُّنیا'' کہ لوگوں میں سب سے زیادہ ہوشیار دنیا کو سب سے زیادہ چھوڑنے والا ہے۔ یعنی جو آدمی دنیا سے جتنا زیادہ بچا رہا وہ سب سے بڑا ہوشیار اور دانا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک نوجوان نے کھڑے ہوکر رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہوشیار اور سمجھدار آدمی کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو اُن میں موت کو سب سے زیادہ یاد رکھتا ہو اور جو اُن میں موت کے آنے سے پہلے، مرنے کے بعد آنے والے زمانہ کے لیے سب سے زیادہ تیاری کرنے والا ہو۔

دنیاوی لحاظ سے انسان کتنی ہی ترقی کرے؛ بڑے بڑے ایجادات کرے، چاند پر چڑھ جائے، حیران کن کارنامے سرانجام دے، محلات بنائے، اعلیٰ عہدے حاصل کرے، بہت زیادہ مال و دولت کمائے لیکن اگر وہ اپنے مقصدِ حیات سے غافل رہتا ہے، اپنے نفس کو نہیں پہچانتا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرکے عبادت نہیں کرتا تو حقیقت میں یہ آدمی اندھا، بہرا اور کم عقل ہے، اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے کہ ﴿لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا، وَ لَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِھَا، وَ لَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِھَا، اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ، اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ (الاعراف:۱۷۹) ترجمہ: ''ان کے دل ہیں جن سے وہ (حق کو سوچتے) سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ (مناظر قدرت اور اللہ تعالیٰ کی نشانیاں) دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ (حق کی باتیں) سنتے نہیں، وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہی لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں''۔

دین کے لیے فکرمندی اور جستجو

مادہ پرستی کے اس دور میں لوگوں کی غفلت اور دین بیزاری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان کو ہر دنیاوی کام بہتر سے بہتر انداز میں کرنے کی فکر ہوتی ہے لیکن مذہب کی اہمیت اور اس کے لیے فکرمندی بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ صبح سے شام تک انسانی محنت اور طلب وجستجو کا واحد محور بس دنیا اور مال و دولت ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ انسان دنیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ آخرت کے لیے فکرمند ہوتا لیکن بات بالکل برعکس ہے۔ غور کریں، جب ہم کوئی دنیاوی کام کرتے ہیں؛ مثلاً گھر بناتے ہیں، زمین یا گاڑی خریدتے ہیں، نوکری تلاش کرتے ہیں، اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے کسی سکول وکالج یا یونیورسٹی کا انتخاب کرتے ہیں، زمین میں فصل بونے کے لیے تخم دیکھتے ہیں، شادی کرتے ہیں، کوئی نیا کاروبار شروع کرتے ہیں، یہاں تک کہ بازار میں کپڑا یا جوتے خریدتے ہیں تو ان تمام امور میں ہم کئی کئی روز غور وفکر کرتے ہیں، ان شعبوں سے منسلک ماہرین اور تجربہ کار لوگوں سے صلاح ومشورے کرتے ہیں اور اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ یہ کام بہتر سے بہتر انداز میں طے پائے اور بہرصورت اس میں کوئی کمی یا کوتاہی واقع نہ ہوجائے۔ حق یہ تھا کہ اس سے بڑھ کر فکرمندی ہم دین ومذہب سے متعلق امور میں کرتے اور ہر وقت اس غم میں مبتلا ہوتے کہ ہمارے عمل اور دینی امور میں کوئی کمی اور نقصان نہ رہے۔ لازم تھا کہ ہم اس سلسلہ میں دیندار لوگوں اور علماء کرام کے پاس جا کر مشاورت کرتے اور شرعی لحاظ سے اپنے آپ کو مزید بہتر بنانے کی طلب وجستجو کرتے۔ یہ بہت قابل غور بات ہے کہ دین کتنا وسیع جو ہر عمل کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس کو سیکھنے کے لیے کچھ بھی فکر نہیں۔ ہمارے معاملات اور رسوم و رواجات شریعت کے خلاف ہیں لیکن ہمیں یہ فکر نہیں کہ اس بارے میں شریعت کا حکم معلوم کریں۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو صرف نماز سے متعلق تمام احکامات معلوم کرنا اور ان کا

علم حاصل کرنا بھی کافی مشکل ہے۔ علماء کرام سالہا سال قرآن و حدیث اور فقہ کا علم حاصل کرنے کے لیے مدارس میں وقت گزارتے ہیں اور پھر اس کے بعد اُن کی پوری زندگی انہی کتابوں اور دینی مسائل سے وابستہ ہوتی ہے لیکن اُن کو بھی ہر معاملہ کا شرعی حکم یاد نہیں رہتا اور پوچھنے پر وہ بھی کتاب کی طرف جاتے ہیں۔ یقین کریں کہ بعض دفعہ نماز جیسی ہر وقت ادا کی جانے والی عبادت کے بارے میں بھی کوئی مسئلہ پوچھا جاتا ہے تو اس کا جواب بھی ایک عالم کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح معاملات اور دیگر چیزوں کے بارے میں بھی دیکھیں۔ تو جب صبح و شام مدارس میں رہنے والوں کو پورا دینی علم حاصل نہیں ہو سکتا تو عوام کس قدر غفلت میں ہوں گے اور شریعت کے بارے میں ان کے علم اور معلومات کا کیا حال ہوگا!! ہمارے مرد اور خواتین دین کے سلسلے میں بہت غافل ہیں۔ زندگی گزر جاتی ہے، ہر معاملہ نمٹا دیا جاتا ہے لیکن کسی کو بھی یہ غم نہیں کہ آیا میرا یہ کام شریعت کے مطابق ہے؟ اور اس میں درست طریقہ کیا ہوگا؟ یہی مسلمان ہیں جو جنت جانے کی امید بھی رکھتے ہیں لیکن اپنے کاروبار، صنعت، تجارت، رسوم، گھریلو زندگی، معاشرتی زندگی، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور اخلاق وغیرہ کے سلسلے میں کہیں بھی ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ یہاں شریعت کا حکم کیا ہوگا۔ بہر حال ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ضرورت کے تحت اپنی زندگی اور سرگرمیوں سے متعلق دینی علم ضرور حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں دنیا اور مال و دولت کی اہمیت و ضرورت بڑھ گئی ہے اور اس کے مقابلے میں موت، قبر، حساب و کتاب، پل صراط، روزِ محشر اور جہنم جیسے ہولناک اور خطرناک مراحل کی سوچ ہمارے دل و دماغ سے بالکل نکل گئی ہے۔ اسی لیے تو نہ اس طرف کوئی توجہ ہے اور نہ کوئی تیاری۔

دین کے لیے عقل وفکر کا فقدان

بعض لوگ جب کوئی وعظ سنتے ہیں یا ان کو دین وشریعت کے بارے میں نصیحت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ اب ہمارا وقت گزر گیا ہے، ہم دینی احکامات اور قرآن وحدیث کی باتیں نہیں سیکھ سکتے، ہمارا دماغ کمزور ہے، ہماری عقل اور ذہن میں اب یہ چیزیں نہیں آتیں۔ بڑی عجیب بات ہے کہ یہی لوگ ہر وقت دنیاوی کاموں میں مشغول ہوتے ہیں؛ گھر بناتے ہیں، زراعت کرتے ہیں، تجارت کرتے ہیں، اولاد اور پورا خاندان پالتے ہیں، محنت ومزدوری کے سلسلہ میں گھر سے باہر دور تک جاتے ہیں اور ان تمام امور اور سرگرمیوں کے لوازمات و ضروریات سے واقف بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح مال و دولت کمانے کے جملہ طریقے جانتے ہیں، دنیاوی لحاظ سے ہر اچھے بُرے کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں، اپنے ظاہری نفع ونقصان کی چیزوں کو پہچان لیتے ہیں، آمدن کے ذرائع سے واقف ہوتے ہیں، فصلوں کے لیے موزون اور غیر موزون موسم سے باخبر ہوتے ہیں، لمبی لمبی فضول اور لغو کہانیاں ان کو ازبر زبانی یاد ہوتی ہیں اور اپنی پوری زندگی کا نقشہ منٹوں میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وغیرہ، لیکن اگر ان کو عقل اور سمجھ نہیں تو وہ صرف قرآن وحدیث اور شرعی احکامات سیکھنے کی نہیں۔ اگر ان کا دماغ کمزور ہے تو صرف دین سیکھنے کے لیے کمزور ہے۔ اگر وہ کوئی راستہ نہیں نکال سکتے تو وہ صرف دین اور اس پر عمل کا راستہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِراً مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ ترجمہ: (وہ (لوگ) دنیوی زندگی کے ظاہری رُخ کو جانتے ہیں اور آخرت کے بارے میں ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس سے غافل ہیں)۔

یعنی یہ لوگ دنیاوی آسائش اور یہاں کے اچھے بُرے کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں لیکن

آخرت اوراس کے لیے درکار تیاری سے بالکل غافل اور بے خبر ہیں۔ان کو پتہ ہی نہیں کہ اس عارضی دنیااور زندگی کا انجام کیا ہوگا اور وہاں انہیں کون کون سے مراحل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں''ان میں سے ایک شخص دنیا میں اتنا ہوشیار ہوتا ہے کہ درہم کو اپنے ناخن پر پلٹائے گا اور آپ کو اس درہم کا وزن بتائے گا لیکن دین کے بارے میں اس کی حالت یہ ہے کہ اُسے نماز پڑھنا بھی نہیں آتی''۔

درحقیقت اصل بات اہمیت وضرورت اور توجہ کی ہوتی ہے۔آدمی کے دل میں جس چیز اور معاملہ کی ضرورت اور اہمیت محسوس ہوجائے تو وہاں اس کی عقل بھی کام کرتی ہے اور وہ اُس کام سے متعلق تمام لوازمات اور درکار چیزوں سے اچھی طرح واقفیت بھی حاصل کرلیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو مطلوبہ کام میں پوری مہارت حاصل ہوجائے۔دین کے معاملے میں بھی یہی بات ہے کہ جن کے دلوں میں اس کی اہمیت نہیں ہے اور اس کے بارے میں علم حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تو پھر وہ اس قسم کے حیلے بہانے بناتے ہیں۔ایسے لوگوں کے دلوں میں جتنی اہمیت دنیاوی کاموں کی ہے اگر اتنی اہمیت دین سے متعلق پیدا ہوجائے تو پھر یقیناً ان کو دین سمجھنے اور دینی باتوں کو یاد کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے گی۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین ومذہب کے سلسلے میں دل ودماغ کا بند ہوجانا یقیناً بدبختی اور بہت بڑی محرومی ہے۔لوگوں کے جس طبقے کا یہاں ذکر ہوا، وہ تو سستی، کاہلی اور عدم توجہ کی وجہ سے ایسے بن جاتے ہیں جبکہ ایک طبقہ ان شقی اور بدبخت لوگوں کا بھی ہے جن کے دل ایسے کالے ہوجاتے ہیں اور شیطان اُن پر اتنا غلبہ حاصل کرلیتا ہے کہ پھر نہ تو کوئی دینی وعظ اور مسئلہ ان کے ذہنوں میں بیٹھتا ہے اور نہ دین سیکھنے اور دینی مجلس میں اُن کے دل لگتے ہیں، بلکہ دینی امور، مباحثوں اور محافل میں وہ تھکاوٹ اور بوریت محسوس کرتے ہیں۔

آج آدمی کے پاس وقت ہے کہ وہ اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے ہر وہ کام کرے

جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد یہی شخص بہت پچھتائے گا لیکن وہ افسوس اس کو کچھ فائدہ نہ دے گا۔ دوزخ میں جانے کے بعد دوزخیوں کے افسوس اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جواب کا منظر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے کہ: (ترجمہ: ''اور وہ (دوزخی لوگ) اس دوزخ میں چیخ و پکار مچائیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں باہر نکال دے، تاکہ ہم جو کام پہلے کیا کرتے تھے، انہیں چھوڑ کر نیک عمل کریں۔ (ان سے جواب میں کہا جائے گا کہ:) بھلا کیا ہم نے تمھیں اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس کسی کو اس میں سوچنا سمجھنا ہوتا، وہ سمجھ لیتا اور تمھارے پاس خبردار کرنے والا بھی آیا تھا، اب مزہ چکھو، کیونکہ کوئی نہیں ہے جو ایسے ظالموں کا مددگار بنے'')۔ (سورہ فاطر: ۳۷)۔ یعنی اب تمھیں نیک عمل کے لیے کوئی موقع نہیں دیا جائے گا، اس لیے کہ دنیا میں تیرے سامنے دینی احکامات آچکے تھے اور دین سے خبردار کرنے والے بھی موجود تھے۔ اسی طرح تمھیں اتنی زندگی بھی ملی تھی جس میں تم دین اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کر کے اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچا سکتے تھے۔

دین اور نیکی کے کاموں کے لیے وقت نہ ہونا

مادہ پرستی کے باعث پوری توجہ اور اہمیت دنیا ہی کو دینے کے بعد دین سے دوری، غفلت اور عدم توجہ کی حالت یہ ہے کہ لوگوں کے پاس دنیا کے ہر کام کے لیے وقت ہوتا ہے۔ دنیا اور اپنے نفسانی شوق کی تکمیل کے لیے کسی بھی طریقہ سے وقت نکال لیتے ہیں لیکن جہاں دین و مذہب، اُس پر عمل یا دین سے متعلق کسی معاملے کی بات آتی ہے تو وہاں دنیاوی مصروفیات رکاوٹ بن جاتی ہیں اور نیکی کے کاموں کے لیے تھوڑا سا وقت دینا بھی مشکل سمجھا جاتا ہے۔ دنیاوی محنت و مزدوری اور ذرائع آمدن کی تلاش میں لوگ مہینوں اور سالوں گھر سے باہر وقت گزارتے ہیں۔ صبح سے شام تک دکانوں، فیکٹریوں، کھیتوں اور بازاروں میں مصروف ہوتے

ہیں لیکن دوسری طرف دین سیکھنے، دینی مجالس میں شرکت کرنے، علماء کے پاس جانے، تبلیغی جماعت کے ساتھ تین دن لگانے یا مسجد میں وعظ وتعلیم سننے کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت آدمی کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے تو پھر اُسی کو اہمیت دے کر اپنا وقت اور صلاحیت اس کام پر قربان کر دیتا ہے۔ یہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی مصروفیات کے بہانے بنا کر دین اور دین سے متعلق کاموں کو وقت نہیں دیتے وہ دوسری طرف اپنا شوق پورا کرنے کے لیے بہت سارے غیر ضروری اور فضول بلکہ گناہ کے کاموں کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں اور ان کاموں کے لیے اپنی دیگر بہت ساری اہم مصروفیات اور ضروری کام چھوڑ بھی دیتے ہیں؛ جیسے پرفضا اور تاریخی مقامات دیکھنے کی غرض سے سیر وسیاحت کے لیے جا کر وہاں کئی کئی گھنٹے بلکہ کئی کئی دن گزارنا، مشاعروں اور محفل موسیقی میں سارا دن اور پوری رات بیٹھنا، کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے صبح سے شام تک اسٹیڈیم میں رہنا، فلم اور ڈرامہ دیکھنے کے لیے ٹی وی کے سامنے بیٹھنا، وغیرہ۔ اسی طرح سخت گرمی میں لوگ سارا دن کاموں میں لگے رہتے ہیں لیکن تھکاوٹ کی فریاد نہیں کرتے۔ سپورٹس، فلمیں، مشاعرے، موسیقی وغیرہ کے لیے گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں لیکن اُن پر یہ چیزیں بوجھ نہیں بن جاتیں۔ اس کے مقابلے میں اگر مسجد میں امام صاحب دوران نماز قرأت تھوڑی لمبی کرے، خطیب صاحب اپنی تقریر میں وقت زیادہ لے، مسجد میں تعلیم کا دورانیہ معمولی سا بڑھ جائے یا کسی مذہبی محفل میں ذرا سی تاخیر ہوجائے تو ان لوگوں پر یہ وقت بہت بڑا بوجھ بن جاتا ہے۔

ہر ہر دیوار پر مذہبی پروگرامات؛ جیسے ختم قران، درس قرآن یا کسی اور روحانی مجلس میں شرکت کی دعوت کے لیے پوسٹرز اور اشتہارات لگے ہوتے ہیں لیکن پروگرام اور تقریب میں علماء، طلبہ اور مبلغین کے علاوہ عوام میں سے گنتی کے چند لوگ شریک ہوتے ہیں، جبکہ سپورٹس کے میدانوں، میلوں، مشاعروں اور موسیقی کی محفلوں میں بغیر دعوت کے معمولی اطلاع پر سینکڑوں

بلکہ ہزاروں لوگ پہنچ جاتے ہیں اور پوری پوری رات وہاں گزارتے ہیں، جہاں نہ اُن کو تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے اور نہ نیند آتی ہے۔ دنیا کمانے کے لیے محنت میں مبتلا شخص شادیوں، غمیوں، دوستوں کے پاس جانے اور دیگر غیر ضروری کاموں کے لیے اپنی مصروفیات سے کئی کئی دن چھٹی کرتا ہے لیکن دین کی خاطر کوئی ایک گھنٹہ بھی اپنی دکان یا کاروبار بند کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

اس عنوان کے تحت یہ بات بھی آسکتی ہے کہ لوگوں کا پیسہ بھی سارا کا سارا اپنے پیٹ، دنیا اور فضول ولغو کاموں میں لگتا ہے اور اس کا تھوڑا سا حصہ بھی دین اور ثواب کی جگہوں میں صرف نہیں ہوتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو صحیح معنوں میں اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ عموماً حالت یہ ہے کہ لوگوں کے ہاں گھر بنانے، بچوں کی عصری تعلیم، شادی بیاہ، غیر ضروری دعوتوں، رسمی خیراتوں، لباس وطعام، رسوم ورواجات، سیر وسیاحت، بے جا مہمان نوازی، کھیل تماشوں اور دیگر فضولیات میں ہزاروں لاکھوں روپے ضائع ہوجاتے ہیں اور بے دریغ خرچ کرتے ہوئے وہ کچھ بھی پریشانی محسوس نہیں کرتے لیکن دوسری طرف مسجد و مدرسہ، کسی واقعی غریب و مستحق کے ساتھ تعاون یا نیکی کے دیگر کاموں میں دینے کے لیے پچاس یا سو روپے دینے کو بھی تیار نہیں ہوتے اور اگر کہیں رقم خرچ بھی کریں تو یا بڑی پریشانی اور بوجھ کے ساتھ دیتے ہیں اور یا دکھلاوے کے لیے۔

مذکورہ بالا تمام باتیں دین سے تعلق نہ ہونے، دل میں مذہب اور نیکی کے کاموں کی اہمیت کم ہونے اور دنیا کے ساتھ انتہائی محبت کی علامت ہیں۔ ان کے مقابلے میں دیندار اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمانے کے خواہشمند لوگوں کا زیادہ وقت اور پیسہ دین کے کاموں میں لگتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی دنیا اور دنیاوی مصروفیات کو مکمل طور چھوڑ کر سارا دن مسجد میں بیٹھ جائے یا چوبیس گھنٹے دینی کاموں میں ہی لگا رہے۔ جیسا کہ گذشتہ عنوانات میں ذکر

کیا گیا کہ دنیا کو اسباب اور تدبیر کے درجے میں رکھ کر اتنا وقت دیا جائے کہ اس سے آدمی کا دینی نقصان نہ ہوجائے۔ بے شک دنیاوی مصروفیات جاری رہیں، اس لیے کہ ان کے بغیر بھی زندگی گزارنا مشکل ہے لیکن شریعت پر عمل کو نہ چھوڑا جائے۔ مختلف عنوانات کے تحت کئی دفعہ یہ بات ذکر ہوئی کہ انسان کی زندگی کا اصل مقصد عبادت ہے جس کے لیے بہرصورت وقت نکالنا ہے۔ جس طرح دنیاوی امور میں بھی جب کوئی زیادہ اہم کام پیش آئے تو اس کے لیے ہم معمول کی ضروریات اور مصروفیات کو چھوڑ دیتے ہیں، جیسے اگر آدمی خود یا اس کے گھر میں کوئی بیمار ہوجائے تو وہ سب کچھ چھوڑ کر ہسپتال پہنچ جاتا ہے، اس لیے کہ اس وقت یہ کام اس کے لیے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی فوتگی میں شرکت، بڑے مہمان کی مہمان نوازی، اپنے کھانے پینے اور سونے وغیرہ کے لیے بھی آدمی کسی بھی حال میں وقت نکال لیتا ہے۔ اب آدمی خود ہی کوئی طریقہ اور ترتیب وضع کر کے ایسا توازن برقرار رکھے کہ دنیا کی خاطر دین و مذہب کا نقصان نہ ہو اور آدمی گنہگار نہ ہوجائے جبکہ ساتھ ساتھ دنیاوی ضروریات بھی پوری ہوجائیں۔

شیطان کا دھوکہ

گذشتہ صفحات میں دین سے غافل اور دنیا کے مال و دولت میں مبتلا لوگوں کا ذکر ہوگیا۔ اس طرح کچھ لوگ وہ بھی ہوتے ہیں جو مختلف شعبوں میں اضافی طور پر اپنی کسی سوچ یا نظریہ کے تحت ''خدمات'' کے نام سے سرگرمیوں اور مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی بڑا کام کر رہے ہیں۔ کوئی قومیت کے نام پر، کوئی زبان کے عنوان سے، کوئی سیر و سیاحت اور پہاڑوں پر چڑھنے کے حوالے سے، کوئی ادب کے میدان میں، کوئی کھیل کود اور فلمی دنیا میں، غرض بیسیوں سینکڑوں ایسے شعبے ہیں جہاں مختلف افراد مختلف انداز میں مصروف عمل ہیں اور اپنے ذوق اور نفسانی خواہش کی تکمیل کے تحت ان کی سوچ ہے کہ ہم کسی بڑی خدمت میں

لگے ہوئے ہیں۔ٹھیک ہے دنیاوی اعتبار سے لوگ اُس عمل کو خدمت یا کارنامے میں شمار کریں گے۔ ہوسکتا ہے اس سے ملک اور علاقے کا نام ''روشن'' ہو۔ممکن ہے اس عمل سے کچھ لوگوں کی طبیعت اور مزاج کو وقتی طور خوشی اور نشاط بھی ملے،لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ ''خدمات'' اور کام اس شخص کے لیے ثواب کے باعث ہیں یا اس کے ذریعہ وہ گناہ کمارہا ہے۔آیا شریعت ایسے کاموں کی اجازت دیتی ہے یا اس شخص نے اپنی طرف سے ہی ان کاموں کو ''فلاح و بہبود''، ''ترقی''، اور ''خدمات'' جیسے نام دیے ہیں۔قرآن کریم کی ایک آیت ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ ھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعاً﴾ (الکھف:۱۰۴) ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں کہ دنیوی زندگی میں ان کی ساری محنت (اور کوشش) سیدھے راستے سے بھٹکی رہی، اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت اچھا کام کررہے ہیں''۔

یعنی دنیا میں یہ لوگ جن کاموں کو اپنے ذہن میں اچھا سمجھ کر کرتے تھے، وہ سارے کام بے کار گئے۔اس لیے کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حضور ﷺ کے ارشادات سے ہٹ کر تھے۔ان کاموں کی وجہ سے مرنے کے بعد ان لوگوں کو کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ الٹا نقصان اور خسارے کا باعث بنے۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَھُمْ فِی الْآخِرَۃِ اِلَّا النَّارُ، وَ حَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِیْھَا وَ بٰطِلٌ مَّا کَانُوا یَعْمَلُوْنَ. (ھود:۱۶) ترجمہ: یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں۔اور جو کچھ انھوں نے دنیا میں کیا وہ برباد ہوا، اور بے کار ہوا جو کچھ وہ کرتے تھے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ نشاطِ طبع اور طبیعت کی تازگی کی خاطر ذہنی آرام کے لیے بعض اوقات مباح کام کرنا کوئی گناہ نہیں ہے؛ جیسے کبھی آدمی سیر وسیاحت کے لیے کسی پرفضا مقام پر جائے، کسی وقت جائز کھیل کود میں حصہ لے یا شرعی حدود کے اندر شعروشاعری کی

محفل کا انعقاد کرے، وغیرہ لیکن ان کاموں کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد بنانا (کہ صبح وشام آدمی فقط انہی کاموں میں لگا رہے، تو پھر یہ) ناجائز اور گناہ ہے۔ جیسے آج کل کچھ لوگوں کی پوری زندگی گانے بجانے میں گزر جاتی ہے، کوئی ہر وقت شعروشاعری اور ادب کی ''خدمت'' میں لگا رہتا ہے، کوئی محافل موسیقی کا انعقاد کرتا ہے، کوئی پہاڑوں کی چوٹیاں سر کر کے نام کماتا ہے، کوئی مستقل سپورٹس اور کھیل کود سے منسلک رہتا ہے اور کوئی فلمی دنیا میں منہمک ہوتا ہے۔ ایسے لوگ دھوکے اور خسارے میں ہوتے ہیں، کیونکہ یہ کام شریعت کی نظر میں نہ صرف غیر ضروری اور غیر مفید ہیں بلکہ الٹا گناہ کے باعث بھی ہیں۔ دین اسلام نے ہر لغو اور فضول کام سے منع کیا ہے؛ جیسے ایک حدیث میں ہے کہ ''آدمی کے اسلام کی اچھائی میں سے یہ بھی ہے کہ وہ لایعنی (اور لغو وفضول) کام چھوڑ دے''۔ قرآن کریم میں نیک لوگوں کے اوصاف میں ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ (وہ لوگ جو لغو باتوں سے اعراض کرنے (اور منہ موڑنے) والے ہوتے ہیں) (مومنون:۳)۔ ایک اور جگہ ہے کہ ﴿وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ﴾ (اور جب لغو (یعنی بے فائدہ) باتوں کو سنتے ہیں تو ان سے منہ پھیرتے ہیں) (القصص:۵۵)۔

علماء کے نزدیک لغو اور فضول کام اس کو کہتے ہیں کہ جس میں کوئی دینی فائدہ نہ ہو اور دنیاوی زندگی کے لیے بھی وہ بنیادی ضروریات میں شامل نہ ہو، البتہ یہ بھی یاد رہے کہ اگر کوئی کام دنیوی لحاظ سے کسی طرح مفید بھی ہو لیکن اُس میں آخرت کا نقصان ہو تو وہ کام پھر بھی شریعت کی نظر میں لغو اور فضول ہو جاتا ہے۔ یا جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ کوئی کام فی نفسہ ناجائز نہیں ہوتا لیکن اگر اس میں کوئی حد سے زیادہ توجہ دیتا ہے اور اس کی وجہ سے دین پر عمل چھوٹ جاتا ہے تو وہ کام بھی ناجائز بن جاتا ہے۔ اسی طرح رزق کمانے اور آمدنی کی خاطر اگر کوئی کام کیا جاتا ہے تو اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ وہ کام مباح اور جائز ہوگا۔ ایسا کام جو بذات خود جائز نہ ہو یا مباح

ہولیکن گناہ کا باعث بنتا ہوتو پھراس کے ذریعے رزق کمانا اور آمدنی بڑھانا بھی ناجائز ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کی بندہ سے ناراضی کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کو لایعنی اور فضول کاموں میں لگا دیتا ہے''۔ آج زمانے میں کچھ لوگوں کا دعوی ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کا مقصد لوگوں کو خوش کرنا، ان کو ہر وقت ہنستے رکھنا اور ان کی تفریح کے لیے محافل اور تقریبات کا اہتمام کرنا ہے۔ تو وہ کبھی محفل موسیقی کا انعقاد کرتے ہیں جو سراسر ناجائز ہے، کبھی مشاعرے کی مجلس لگاتے ہیں، جہاں بھی اکثر لغو اور شرعی لحاظ سے ناجائز اشعار پیش کیے جاتے ہیں، کبھی لوگوں کو ہنسانے کے لیے مخصوص افراد کو لایا جاتا ہے جو جھوٹ بول کر اور فرضی لطیفے سنا کر لوگوں کو ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک حدیث میں ہے کہ: ''ہلاکت (یا جہنم کی وادی) ہے اُس شخص کے لیے جو لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹ بولتا ہے، ہلاکت ہے ایسے شخص کے لیے، ہلاکت ہے ایسے شخص کے لیے''۔ (ابو داؤد)۔

آج کل ثقافت کے نام سے ہر جگہ محافل موسیقی کا انعقاد ہوتا ہے جس میں بعض دفعہ مرد وعورت کے مشترکہ ڈانس اور گانے بجانے بھی ہوتے ہیں۔ لوگ بڑے خوش ہوتے اور اس عمل کو سراہتے بھی ہیں۔ ایسی مجالس کے لیے باقاعدہ پیسے دیکر گلوکاروں، گانے والی عورتوں، طوائفوں اور دیگر آرٹسٹ لوگوں کو بلایا جاتا ہے، حالانکہ قرآن وحدیث میں اس کی سخت مذمت آئی ہے؛ جیسے سورہ لقمان کی ایک آیت میں ہے کہ ﴿ کچھ لوگ ایسے ہیں جو لغو اور فضولیات خریدتے ہیں، تاکہ دیگر لوگوں کو اللہ کے راستے سے گمراہ کریں ﴾۔ اسی طرح ایک حدیث منقول ہے کہ ''جو شخص گانے والی عورت کی مجلس میں بیٹھ کر اس کا گانا سنے گا تو قیامت کے روز اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا''۔ اس کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی قسم قسم کے کھیل تماشوں میں لوگ مصروف ہوجاتے ہیں۔ ایسی تقریبات اور پروگرامات منعقد کرنے والے اور ان میں

شرکت کرنے والے دونوں گنہگار ہوتے ہیں۔ بہرحال شیطان نے لوگوں کو بہکانے اور دین کے بجائے لایعنی اور بے فائدہ کاموں میں مبتلا کرنے کے لیے بہت سارے حربے بنائے ہیں اور شیطان ہی نے ان لوگوں کی روح اور نفس پر قبضہ کرکے برے اور غلط کاموں کو ان کے لیے خوشنما اور باعث خوشی وتفریح بنادیا ہے۔ اور یہی مسلمان ہیں جو شیطان کے دھوکے میں آکر ان فضولیات میں نہ صرف لگے رہتے ہیں بلکہ ان کاموں کو باعث فخر بھی سمجھتے ہیں۔

اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی پوری محنت اور دوڑ دھوپ بس دنیا ہی کے لیے ہوئی اور آخرت کے لیے کچھ بھی نہ کیا اور پھر بھی اپنی زندگی سے مطمئن رہے، اور سمجھتے رہے کہ ہمارا سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی گفتگو اور انداز پر غور کرے؛ جب کوئی اپنے اطمینان اور راحت وسکون کا ذکر کرتا ہے تو صرف دنیاوی لحاظ سے کرتا ہے کہ ''الحمدللہ'' میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں، میرا کام ٹھیک چل رہا ہے، جو حال ہے یہ میرے لیے کافی ہے، وغیرہ۔ اگرچہ دوسری طرف یہ آدمی آخرت کے لحاظ سے انتہائی نقصان میں پڑا ہوتا ہے۔ قبر کے لیے اس کی کچھ بھی تیاری نہیں ہوتی اور پوری زندگی شریعت کے خلاف گزر رہی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے آخرت کے بجائے دنیا ہی کو اپنے سب کچھ کا معیار بنالیا ہے۔

جاری عنوان کے شروع میں جو آیت ذکر ہوئی تھی اُس کے ضمن میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اگرچہ ایسے کاموں میں مصروف ہوں جو شرعی لحاظ سے درست بلکہ باعث ثواب بھی ہوں لیکن کرنے والے کی نیت میں اخلاص نہ ہو، بلکہ یہ سب کچھ دنیاوی اغراض اور نام وشہرت کے لیے کرتا ہو۔ تو ایسے نیک اعمال بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں۔

فخر، مبارکباد اور کسی کی تعریف کا معیار

بحیثیت مسلمان ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر معاشرتی لحاظ

سے بھی کسی کے لیے فخر اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے کا معیار دین و مذہب ہی ہوتا۔ اسی طرح لوگوں کے درمیان اگر کسی کو شاباش دینے، کسی کی بڑائی بیان کرنے یا کسی کی عزت آفزائی کی بات آجاتی تو وہاں بھی معیار کوئی ایسا کام یا کارنامہ ہوتا جس کا تعلق ونسبت دین سے ہو۔ کسی دنیاوی کارنامہ یا عہدہ ومنصب کے حصول پر اگر فخر کیا جاتا ہے، ایک دوسرے کو مبارکباد دی جاتی ہے یا عوام میں اس کو پزیرائی ملتی ہے تو اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ لائق فخر اور باعثِ مبارکباد وہ کام ہونا چاہئے تھا جس کا تعلق دین، مذہب اور آخرت سے ہوتا ہے۔ آج ذہنیت اور معیار اتنا بدل گیا ہے کہ اگر دنیاوی لحاظ سے کوئی کسی شعبے میں نام کماتا ہے، سرکاری وغیر سرکاری عہدہ ومنصب ہاتھ آتا ہے یا کوئی بڑی ڈگری مل جاتی ہے تو وہ آدمی، اس کے والدین، گھر والے اور دوست واحباب فخر کرتے ہیں، خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور دیگر لوگ بھی مبارکباد دینے کے ساتھ ساتھ بڑی عزت وتوقیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اُس شخص کی پورے علاقے میں شہرت ہوجاتی ہے اور ہر جگہ اس کے تذکرے ہونے لگتے ہیں۔ اس ''مقام ومرتبہ'' کو دیکھ کر دیگر لوگ بھی اپنے اور اپنی اولاد کے لیے اس ''عزت'' کی خواہش اور تمنا ظاہر کرتے ہیں۔ کچھ کام اور کارنامے وہ ہیں جو کم ازکم دنیاوی ضروریات میں شامل ہیں اور دنیوی اعتبار سے انسان کے فائدے کے لیے ہیں، لیکن بہت سارے ایسے لغو، فضول اور غیر ضروری کاموں پر بھی فخر کیا جاتا ہے جو دنیوی لحاظ سے بھی غیر ضروری اور بے فائدہ ہیں لیکن لوگ ان پر بھی ایک دوسرے کی تعریف کرتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں۔ ان غیر ضروری کاموں میں مبتلا افراد کی تعریفوں میں گھنٹوں گھنٹوں لگے رہتے ہیں، ان کی تصاویر اپنے پاس رکھتے ہیں اور موقع پانے پر ان کے ساتھ سیلفیاں بھی بناتے ہیں۔ ہم کتنے مسلمان نوجوانوں کو سوشل میڈیا پر دیکھتے ہیں جو بڑے فخر سے کسی فلمی ایکٹر، کھلاڑی، گلوکار یا کسی دوسرے ناجائز کام میں نام کمانے والے کو مبارک باد دیتے ہیں اور اس کے لیے فخر کے الفاظ لکھتے ہیں۔ اسی طرح کبھی انتہائی بیہودہ قسم کی ویڈیو یا تصویر

شیئر کر کے اوپر لکھتے ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہے، یا حسن سب کچھ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں اگر دینی و مذہبی حوالے سے کوئی کسی قسم کا مقام حاصل کرتا ہے؛ جیسے کوئی حافظ قرآن بنتا ہے، عالم دین بنتا ہے، مفتی بنتا ہے، کوئی کسی مدرسہ کی بنیاد ڈالتا ہے، مسجد بناتا ہے یا دین کی نسبت سے کوئی اور کام یا کارنامہ سرانجام دیتا ہے تو اس کا پتہ صرف مذہبی طبقہ کو ہی ہوتا ہے۔ عوام اور دنیا پرست طبقہ کے دلوں میں اس کی اہمیت تو کیا اُس کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کس نے کیا کیا؟ کون عالم بنا اور کون حافظ بنا؟۔۔ نہ اس عمل کے چرچے ہوتے ہیں اور نہ اس شخص کی کوئی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ عام لوگوں کی گفتگو میں میں یہ جملے تو سننے کو ملتے ہیں کہ: فلاں آدمی بڑا خوش قسمت ہے، جس کا ایک یا دو بیٹے ڈاکٹر ہیں، فلاں کا بیٹا انجنیئر ہے، فلاں کے سارے بیٹے سرکاری ملازمت پر ہیں، فلاں آدمی کی بہت جائیداد ہے، فلاں آدمی اعلیٰ عہدے پر فائز ہے، وغیرہ۔ لیکن ایسے جملے شاید ہی کہیں سننے کو ملے کہ فلاں آدمی اور اس کا بیٹا عالم دین ہیں، فلاں کے بیٹے نے قرآن حفظ کیا، فلاں آدمی مدرسہ چلاتا ہے، فلاں آدمی مستقل تبلیغی جماعت سے وابستہ ہے، فلاں آدمی مسجد کی خدمت میں لگا ہے اور یا فلاں آدمی بڑا پرہیزگار و متقی ہے۔ اسی طرح لوگوں کی دوستی کا معیار بھی دنیا ہے؛ جس آدمی کے پاس مال و دولت اور کوئی دنیاوی منصب وعہدہ ہو یا وہ کسی شہرت کا حامل ہو تو دیگر لوگ اس کے قریب ہوجانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے زیادہ اچھے انداز میں ملتے ہیں۔ جبکہ حضور ﷺ کی ایک حدیث سے بات بالکل برعکس معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

> ''بے شک لوگوں میں میرا سب سے زیادہ قابل رشک دوست وہ مومن ہے، جو کم مال اور کم افرادی کنبے والا ہو، لیکن نماز کی زیادہ مقدار والا ہو، اچھے انداز میں اپنے رب کی عبادت کرنے والا، لوگوں میں گمنام ہو، اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ نہ کیا جاتا ہو، اور اس کی موت جلدی آجائے اور

اس کی میراث کم ہواوراس کے رونے والے بھی کم ہوں''۔(مسند احمد)۔

قرآنی آیات اوراحادیث پرغورکرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیادارلوگوں سے متاثر ہونا اوران کی مال ودولت کودیکھ رشک کرنا جائزنہیں، اسی طرح یہ بھی حکم ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ دنیا کے کاموں میں نہیں بلکہ دین کے کاموں میں کرواور ہرآدمی یہ کوشش کرے کہ نیکیوں میں دوسروں سے آگے بڑھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اور دنیوی زندگی کی اس شان وشوکت کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھو، جوہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کومزے اڑانے کے لیے دے رکھی ہے، تاکہ ہم ان کواس کے ذریعے آزمائیں۔اورتمہارے رب کا دیا ہواسب سے بہتراورسب سے دیرپا ہے﴾(طٰہٰ:۱۳۱)۔اس آیت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دنیاوی مال کی طرف رشک یاتمنا کی نظر سے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ مال ودولت صرف دنیاوی شان وشوکت ہے جوان لوگوں کوازمانے کے لیے دیا گیاہے۔اصل دولت تو آخرت کی ہے جوآدمی کونصیب ہوجائے۔حضورﷺ کا ارشادمبارک ہے کہ:''رشک تو بس دوہی آدمیوں پر ہونا چاہئے؛ایک اس پر جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کاعلم دیا اوروہ دن رات اس کی تلاوت کرتا ہے کہ اس کا پڑوسی سن کر کہہ اٹھے کہ کاش مجھے بھی اس جیسا علمِ قرآن ہوتا اور میں بھی اس طرح عمل کرتا، اور دوسرا وہ جسے اللہ نے مال دیا اوروہ اسے حق کے لیے لٹارہا ہے، دوسرا شخص کہہ اٹھتا ہے کہ کاش میرے پاس بھی اس کے جتنا مال ہوتا اور میں بھی اس طرح کی خرچ کرتا''۔(بخاری)۔ایک اورحدیث میں ارشاد ہے کہ:

> ''کسی فاجرشخص کونعمتوں میں دیکھ کراس پررشک نہ کرنا، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ اس کی موت کے بعداس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے،اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مہلک چیز ہے جومرے گی نہیں۔یعنی جہنم''(مشکوٰۃ)۔

عمل تو کیا لوگوں کی گفتگو میں بھی دین کا ذکر تک نہیں ہوتا؛ کوئی کہتا ہے کہ میں اپنے تمام بیٹوں سے خوش ہوں، تمام بڑے کامیاب ہیں، سارے تعلیم یافتہ اور اپنے کاروبار کے مالک ہیں، میں ان کے مستقبل کے حوالے سے بالکل فکرمند نہیں ہوں۔ اگر میں مرتا ہوں تو مجھے اطمینان ہے کہ میری اولاد کامیاب رہے گی کیونکہ ان کے پاس مال و دولت اور زمین و جائیداد کے اعتبار سے کوئی کمی نہیں ہے۔۔۔لیکن دوسری طرف یہ آدمی کبھی نہیں سوچتا کہ دینی اعتبار سے اُس کی اولاد کی حالت کیا ہے!! حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام بیٹے دین، مذہب اور دین پر عمل کرنے کے لحاظ سے بالکل بیگانہ اور غافل ہوتے ہیں۔ یہی معیار ہے جس کی پوری بنیاد دنیا اور دنیاوی ترقی پر ہے۔ لوگوں کے اپنی اولاد سے خوش ہونے اور اطمینان کا معیار دین و شریعت پر عمل نہیں بلکہ دنیا اور دنیاوی کامیابی ہی ہے۔ ایک مسلمان دنیاوی اسباب و تدابیر ضرور اختیار کرے لیکن فخر، شاباش، حوصلہ آفزائی اور مبارکباد کا معیار دین و مذہب ہی ٹھہرائے۔ تمنا اور آرزو اخروی کامیابی کی کرے اور اپنی اولاد کے لیے بھی دنیا کے مقابلے میں آخرت پسند کرے۔

نیکی میں تعاون اور حق کا ساتھ دینا

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ نیکی کے کاموں میں مالی، جانی اور اخلاقی تعاون کرے جبکہ بدی اور گناہ کے کسی بھی کام میں مدد سے گریز کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **وَ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ**۔ (اور آپس میں نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں مدد کرو اور مدد نہ کرو گناہ اور ظلم میں)۔ نیکی سے ہر وہ کام مراد ہے جس کے کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہو یا وہ کام ناجائز نہ ہو۔ اور گناہ وہ ہے جس کو کرنے سے شریعت نے منع کیا ہو۔ آج کل لوگ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرنے میں بہت غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بہت سارے ایسے دینی اور شرعی امور ہوتے ہیں جن میں معمولی تعاون سے بھی آدمی نیکیاں کما

سکتا ہے لیکن لوگ وہاں مالی اور جانی کوئی تعاون نہیں کرتے جبکہ اس کے مقابلے میں اکثر لوگوں کا پیسہ اور وقت ناجائز اور غلط کاموں کے تعاون میں لگ جاتا ہے۔ اسی طرح آیت میں گناہ اور ظلم کی جگہوں میں مدد کرنے سے منع کیا گیا ہے حالانکہ عام مشاہدہ یہ بھی ہے کہ لوگ اپنے تعاون اور مدد کے لیے پیمانہ اور معیار قطعاً یہ نہیں بناتے کہ آیا یہ کام گناہ کا ہے یا ثواب کا۔ یہ عمل جائز ہے یا ناجائز ہے۔ قرآن وحدیث کی رو سے جس نے نیکی کے کسی کام میں تعاون کیا تو جب تک وہ عمل چلتا رہے گا، اس آدمی کو ثواب ملتا رہے گا اور جس نے کسی گناہ کے کام میں مدد کی تو جب تک وہ عمل رہے گا، اس آدمی کو برابر گناہ ملتا رہے گا۔ جس طرح خود نیکی کرنے اور نیکی میں مدد کرنے والے دونوں کو ثواب ملتا ہے، اسی طرح خود بدی کرنے اور بدی اور ظلم میں مدد کرنے والے دونوں گناہ میں بھی برابر ہیں۔ ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ:

> ''جس نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا اور اس اچھے طریقے کی پیروی کی گئی (یعنی لوگوں نے اس کو عمل میں لایا) تو اس کو اس طریقے کا اجر ملے گا اور اس طریقے پر عمل کرنے والوں کے برابر (مزید) اجر ملے گا جبکہ عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور جس نے کوئی برا یعنی گناہ کا طریقہ جاری کیا اور اس برے طریقے کی پیروی کی گئی (یعنی لوگوں نے اس کو عمل میں لایا) تو اس کو اس طریقے کا گناہ ملے گا اور اس طریقے پر عمل کرنے والوں کے برابر (مزید) گناہ ملے گا جبکہ عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی''۔

لہٰذا دین کی اشاعت وتبلیغ، درس وتدریس، فلاحی کاموں، غریبوں اور ضرورتمندوں کی حاجات پوری کرنے، مظلوم کا ساتھ دینے اور اس قسم کے دیگر نیکی کے کاموں میں تعاون کرنا چاہئے۔ اور جہاں کسی عمل میں تھوڑا سا بھی گناہ اور برائی کا امکان ہو تو اس میں تعاون کرنے سے بچنا چاہئے۔

ایسی جگہ ملازمت کرنا بھی گناہ ہے جہاں کسی شکل میں گناہ کے کاموں میں تعاون ہوتا ہو۔

ایک اور خطرناک گناہ جو عوام وخواص میں عام ہے؛ وہ عصبیت، تعلق، رشتہ داری اور علاقائیت کی بنیاد پر کسی کی ناحق حمایت کرنا ہے۔ جب بھی کوئی تنازعہ ہوتا ہے، اختلاف پیدا ہوتا ہے یا مقابلے کا موقع آتا ہے تو لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ حق پر کون ہے اور ناحق کون ہے، بلکہ اپنے رشتہ دار یا دوست کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے اس عمل پر فخر بھی کرتے ہیں۔ بعض دفعہ تو بہت گمراہ کن جملہ بھی دہراتے ہیں کہ ''حق میں تو ہر کوئی ساتھ ہوتا ہے، کمال تو یہ ہے کہ کسی کے ساتھ ناحق موقع پر حمایت میں کھڑا ہو جائے''۔ (نعوذ باللہ)۔ اسی طرح حق بولنے، گواہی دینے اور ثالثی کے مواقع میں بھی لوگ واضح طرفداری کرتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں سوچتے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ بعض لوگ تو اقرار بھی کرتے ہیں کہ مجھے پتہ ہے کہ فلاں آدمی حق پر نہیں ہے لیکن میں تعلق یا خاندانی رشتے کی وجہ سے اُس کی حمایت میں ہوں اور یہ میری غیرت کا تقاضا ہے۔ ایسا کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ایسی صورتحال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَاءَ لِلّٰہِ وَ لَوْ عَلٰی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ، اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا، فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا. (سورہ نساء: ۱۳۵)

ترجمہ: (اے ایمان والو! انصاف قائم کرنے والے بنو، اللہ کی خاطر گواہی دینے والے، چاہے وہ گواہی تمھارے اپنے خلاف پڑتی ہو، یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔ وہ شخص چاہے امیر ہو یا غریب، اللہ تعالیٰ دونوں قسم کے لوگوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے۔ لہٰذا ایسی نفسانی خواہش کے پیچھے نہ چلنا جو تمھیں انصاف کرنے سے روکتی ہو)۔

اس آیت کریمہ میں نہایت واضح انداز سے حکم دیا گیا ہے کہ اگر کسی موقع پر اپنے والدین اور رشتہ

داروں کے خلاف بھی گواہی دینی پڑے یا والدین کے مقابلے میں بھی بات کرنے کی جگہ آجائے تو پھر بھی حق بولنا ہے۔ اگر والدین یا کوئی رشتہ دار کسی مسئلے میں حق پر نہ ہو تو اس کی حمایت چھوڑنی ہے۔ قرآن میں ایک اور جگہ آیت ہے کہ: وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبىٰ۔ (سورہ انعام: ۱۵۲) ترجمہ: (اور جب کوئی بات کہو تو انصاف سے کام لو، چاہے معاملہ اپنے قریبی رشتہ دار ہی کا ہو)۔ اسی سلسلے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جو شخص ظالم کے ساتھ چلے (یعنی اس کی حمایت کرے) تاکہ اس کو مضبوط کرے، حالانکہ وہ جانتا ہو کہ وہ ظالم ہے، تو ایسا شخص اسلام سے نکل گیا۔ (مشکوٰۃ)۔ ایک اور حدیث میں ہے:

''جس شخص نے ناحق کسی ظالم کی مدد کی تاکہ اپنے ناحق اور باطل کے ذریعے حق کو ختم کردے۔ تو ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے ذمے سے نکل گیا اور اللہ کے رسول کے ذمے سے بھی نکل گیا''۔ (السلسلة الصحيحة)

ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ ''جو کسی جھگڑے میں کسی کا ناحق تعاون کرے تو ایسا شخص ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی میں رہے گا، یہاں تک کہ باز آجائے۔ (ابن ماجه)۔ ایک اور حدیث میں تو یہاں تک الفاظ ہیں کہ:

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں لوگوں میں بدترین وہ شخص ہوگا جو دوسرے کی دنیا (بنانے) کے لیے اپنی آخرت برباد کردے۔ (مشکوٰۃ)

علماء کرام اور نیک لوگوں کی قدر و عزت

یہ دین اور قرآن و حدیث کی تعلیمات جو شروع سے آج تک محفوظ ہیں اور لوگ ایک مسلمان کی حیثیت سے دین اسلام سے منسلک ہو کر اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں، بلاشبہ ان سب کچھ کا ذریعہ علماء کرام ہی ہیں۔ یہ علماء کرام اور دین سے وابستہ لوگوں کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کے ذریعے یہ دین قائم رکھا اور قرآن وحدیث کی تعلیمات ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہورہی ہیں۔اسی بنیاد پر حضورﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ: **العلماء ورثة الانبياء ، ان الانبياء لم يورثوا دينارا و لا درهما انما ورثوا العلم فمن اخذ به اخذ بحظ وافر** (ترمذی) ترجمہ: ''علماء (یعنی قرآن وحدیث کا علم رکھنے والے) انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء نے میراث میں دینار اور درہم نہیں چھوڑے (بلکہ) انھوں نے میراث میں علم چھوڑا، تو جس نے یہ (علم) حاصل کیا تو اس نے (پیغمبروں کی میراث میں) بڑا حصہ لے لیا''۔ چونکہ پیغمبروں کا کام مال ودولت جمع کرنا نہیں تھا بلکہ ان کے پاس وحی کا علم ہوتا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے باخبر ہوتے تھے اور پھر ان احکامات کو لوگوں تک پہنچا کر حق اور ناحق سمجھاتے تھے اور یہی کام آج علماء کا ہے کہ وہ علم حاصل کر کے پھر لوگوں میں اس کی تبلیغ واشاعت کرتے ہیں، اس لیے حدیث میں ان کو انبیاء کا وارث کہا گیا۔قرآن وحدیث میں علماء کرام اور دین کا علم رکھنے والوں کی بہت بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور ان کو دیگر لوگوں کے مقابلے میں بہتر قرار دیا گیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: **هَلْ يَستَوِي الَّذِينَ يَعلَمُونَ وَالَّذين لا يَعْلَمُوْنَ** ۔(کیا علم رکھنے والے اور جو علم نہیں رکھتے ، دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟) اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عالم اور جاہل دونوں برابر نہیں ہوسکتے اور اللہ کے نزدیک عالم کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔قرآنی آیات اور بہت ساری احادیث میں علماء کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ زمین پر رہنے والوں میں اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ سب سے زیادہ پسند ہیں جو دین کا علم رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ چونکہ یہ آخری امت ہے اور حضورﷺ کے بعد دنیا میں کوئی نبی نہ اب تک آیا ہے اور نہ آگے قیامت تک آئے گا۔ یہی دین اسلام قیامت تک چلتا رہے گا۔اس لیے جو لوگ دین اسلام کی تعلیمات حاصل کرتے ہیں، ان کی حفاظت کرتے ہیں، لوگوں میں پھیلاتے ہیں اور پھر اگلی نسلوں کو منتقل کرتے ہیں، تو ظاہر ہے ایسے لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کتنا بڑا مقام

ہوگا اوران کی کتنی بڑی حیثیت ہوگی!۔

اگر چہ شروع ہی سے مسلمانوں کے معاشرے میں ایک طبقہ ایسا رہا ہے جس نے علماء کرام اور نیک لوگوں کی مخالفت کی ہے لیکن گذشتہ ادوار میں پھر بھی زیادہ تر لوگوں کے دلوں میں علماء کی قدر ہوتی تھی۔ وہ نیک لوگوں کی عزت واحترام کرتے تھے اور کسی بھی لحاظ سے ان کا ہتک یا ان کے بارے میں بدزبانی برداشت نہیں کرتے تھے۔ لیکن آج کے زمانے میں انتہائی مادہ پرستی، دین سے دوری اور دلوں سے اسلام کی اہمیت نکل جانے کے باعث آہستہ آہستہ عوام کے دلوں میں علماء اور دیندار طبقے کی قدر ومنزلت کم ہورہی ہے۔ علماء کی معمولی سی لغزش اور کوتاہی نشانے پر لی جاتی ہے۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہوجائے تو کچھ لوگ فوراً بڑھا چڑھا کر اعتراض کرتے ہیں بلکہ کوشش کرکے علماء کی خامیاں ڈھونڈ نکالی جاتی ہیں اور پھر ان کے بارے میں طرح طرح کی بدزبانیاں کی جاتی ہیں۔ عام مشاہدہ یہ بھی ہے کہ سب سے زیادہ علماء کے بارے میں وہ لوگ بدزبانی کرتے ہیں جن کو خود قرآن وسنت اور شریعت کے بارے میں تھوڑا سا علم بھی نہیں ہوتا اور عمل کے لحاظ سے بھی ان کی پوری زندگی شریعت کے خلاف گزرتی ہے۔ اسی طرح ان کے ہاتھوں سے کبھی دین کی کوئی خدمت بھی نہیں ہوتی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ آج کا زمانہ انتہائی فساد سے بھرا ہوا ہے۔ پورے معاشرے میں گناہ ہی گناہ پھیلے ہوئے ہیں۔ دیندار طبقہ اور علماء کرام بھی انسان ہیں اور اسی معاشرے میں رہتے ہیں تو ان سے ضرور غلطیاں ہوتی ہیں اور اپنے علم کے مطابق عمل کرنے میں ان سے کوتاہیاں بھی ہوجاتی ہیں لیکن ان کو صحابہ کرام کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ آج دور کے لحاظ سے دیکھا جائے۔ یہ بات حقیقت ہے اور اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ علماء کرام جس طرح دیگر لوگوں سے علم زیادہ رکھتے ہیں، اسی طرح وہ تمام تر غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود دین پر عمل بھی عوام سے زیادہ کرتے ہیں۔ بے شک ان سے گناہ کے کام بھی ہوتے ہوں گے

لیکن ان کے غلط اور گناہ والے کام عوام کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہی علماء کرام اور دین کے نشر واشاعت سے وابستہ لوگ ہیں جو خود اپنی کوشش اور محنت سے دین سیکھتے ہیں اور پھر آ کر مدارس چلاتے ہیں، مساجد سنبھالتے ہیں اور صبح وشام قرآن وحدیث کی تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں۔ یہاں پر تبلیغی جماعت اور دیگر دین پھیلانے والوں کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی معمول کی زندگی میں سے وقت نکال کر دین سیکھنے کے لیے گھروں سے نکلتے ہیں اور پھر واپس ہوکر محلّہ محلّہ جا کر لوگوں کو مسجد اور اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے ہیں۔۔یہی دیندار طبقہ اور علماء کرام ہیں جو معاشرے میں رہ کر درس وتدریس، تصنیف وتالیف، دعوت وتبلیغ، تفسیر وتشریح، وعظ ونصیحت، مختلف مجالس کے انعقاد اور دیگر خدماتِ دین کے ذریعے عوام کی رہنمائی کرتے ہیں اور مسلسل دینی حوالے سے لوگوں کی خدمت میں لگے رہتے ہیں، اور لوگ بھی قرآن وسنت اور شرعی مسائل کے حوالے سے ان علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لہٰذا پورے مسلمانوں کو مذہبی طبقے کا زیرِ احسان رہنا چاہئے۔

تو جب کوتاہیوں، غلطیوں اور انسانی کمزوریوں کے باجود علماء کرام دیگر لوگوں سے علم، عمل گناہوں سے اجتناب اور دینی خدمت کے حوالے سے بہتر ہیں تو پھر علماء اور غیر علماء کے درمیان موازنہ کرتے وقت انصاف سے کام کیوں نہیں لیا جاتا؟۔۔اگر کسی کی نظر علماء اور نیک لوگوں کی غلطیوں پر پڑتی ہے اور ایک ایک غلطی کو لیکر اعتراض کیا جاتا ہے تو اس کے مقابلے میں علماء کرام کے علم، عمل اور دینی خدمت کو کیوں نہیں دیکھا جاتا؟ اور اعتراض کرنے والا یہ کیوں نہیں سوچتا کہ بذات خود میں علم، عمل، دینی خدمت اور گناہوں سے بچنے کے اعتبار سے کسی عالم دین سے بہت کم ہوں اور اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تو پھر کیوں میں علماء پر اعتراض کرکے اور ان کی غیبت کرکے اپنے آپ کو گناہ میں ڈالدوں۔۔اسی طرح اگر کوئی عالم مکمل طور دین کی خدمت نہیں کرتا، تو جتنا کرتا ہے، اس کی تو قدر کرنی چاہئے۔

لہٰذا علماء کرام بہرصورت محترم ہیں؛ ان کے پاس قرآن وسنت کا علم ہے اور کسی نہ کسی شکل میں دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے دل میں ان کا احترام رکھنا چاہئے اور ظاہراً بھی ان کی قدر کرنی چاہئے۔ وہ خود جو بھی کریں اور ان کا اپنا عمل جیسا بھی ہو لیکن کم از کم عوام کو تو قرآن وسنت کی تعلیمات پہنچاتے ہیں اور دین کا سلسلہ قائم رکھ کر لوگوں کی رہنمائی تو کرتے ہیں۔ عالم دین اور دیندار آدمی کی توہین کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور جس شخص کے دل میں علماء کی قدر نہیں ہوتی اس کو دین سیکھنا اور دین پر عمل کرنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی عالم کی توہین اس وجہ سے کرتا ہے کہ اس کے پاس دین کا علم ہے تو ایسا آدمی کافر اور گمراہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عالم دین کو اس کی غلطیوں کی وجہ سے نشانہ بنا کر بے ادبی اور گستاخی کی جاتی ہے تو یہ عمل بھی گناہ اور غیر مناسب ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ: ''جب میری امت اپنے علماء سے بغض رکھنے لگے گی تو اللہ تعالیٰ ان پر چار قسم کے عذاب مسلط کرے گا؛ قحط سالی، بادشاہ کی طرف سے مظالم، حاکموں کی خیانت اور دشمنوں کے تواتر سے حملے''۔ (منقول بحوالہ مستدرک للحاکم)۔ کنز العمال کے حوالے سے ایک حدیث اس طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''عالم زمین پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے، تو جس نے عالم کی عیب جوئی کی وہ ہلاک ہوگیا''۔

عوام کی ذمہ داریاں

ایک عام مسلمان کے نیک، دیندار اور متقی بننے کے لیے اولین عمل دل ودماغ میں فکر کا پیدا ہونا ہے، جس سے متعلق گذشتہ سطور میں تفصیل سے بحث کی گئی۔ اب دل میں فکر اور طلب پیدا ہوجانے کے بعد دین سے مسلسل تعلق برقرار رکھنے کے لیے عام مسلمان درجہ ذیل چند امور پر عمل کریں:

(۱) دین سیکھنے کا اہتمام

ہر آدمی پر یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کسی مدرسہ میں جا کر باقاعدہ نصابی کتابیں پڑھے اور تمام کے تمام احکامات سے واقفیت حاصل کرے، البتہ اتنا علم ہر مسلمان مرد وعورت پر ضرور فرض ہے جس کے ذریعے وہ حلال وحرام اور جائز وناجائز معلوم کر کے اپنی روزمرہ کی زندگی دین و شریعت کے مطابق گزار سکے۔ لہٰذا ہر آدمی کسی عالم یا دیندار شخص سے قرآن وحدیث کی تعلیمات سیکھے، اسلامی کتابوں کا مطالعہ کرے اور دیگر ممکن ذرائع سے دین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی کسی مخصوص شعبہ سے وابستہ ہے؛ جیسے تجارت، صنعت، سرکاری یا پرائیویٹ ملازمت، سیاست وحکومت، زراعت اور حرفت وغیرہ تو اس کے بارے میں شرعی احکامات معلوم کر کے فوری عمل شروع کرے۔ ہر کسی کو خود پتہ ہوتا ہے کہ اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں صبح سے شام تک کن امور سے اس کا واسطہ پڑتا ہے تو ان سے متعلق علم حاصل کرے۔ اسی طرح نماز وغیرہ کی طرح اللہ تعالیٰ کے دیگر احکامات کون کونسے ہیں؟ ہاتھ، آنکھ، کان اور دیگر اعضاء کے استعمال کا جائز طریقہ کیا ہے؟ اور ساتھ ساتھ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں معلومات حاصل کر کے قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کا ارادہ کرے۔

(۲) زندگی بدلنے کا عزم

جب بندہ کے دل میں اپنے گناہوں کا احساس اور دین کی طرف رغبت پیدا ہوجائے تو اب پکا عزم کرلے کہ مجھ سے اب تک جتنے گناہ کے کام ہوئے ہیں وہ آئندہ نہیں کروں گا اور اپنی پوری زندگی کو شریعت کی تابع بنانے کی کوشش کروں گا۔ ظاہر ہے شیطان اور نفسانی خواہشات انسان کے لیے دین پر عمل کرنے میں بڑی رکاوٹ ہوتی ہیں لیکن یہاں انسان ہر وقت اللہ تعالیٰ

سے توفیق کی دعا کر کے ان دشمنوں کا مقابلہ کرے۔ اپنی انفرادی، اجتماعی، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی زندگی کو بدلنا یقیناً ایک مشکل عمل ہوتا ہے، اس لیے کہ جب کوئی سالہا سال کسی عمل، مزاج، طور طریقوں اور کردار کا عادی بن جاتا ہے تو پھر اس کے لیے واپس لوٹنا دشوار ہوتا ہے، لیکن جب انسان کے دل میں صحیح معنوں میں خوفِ خدا اُتر جائے اور اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ میری زندگی کا واحد مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔ مجھے موت، قبر اور قیامت کے دن جیسے مشکل مراحل طے کرنے ہیں اور یہ بندہ ہر وقت اپنے دماغ میں اللہ تعالیٰ کی یاد رکھ کر ان باتوں پر غور کرے تو پھر اپنی عادات و اطوار اور زندگی کو بدل کر شریعت کے موافق بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ لہٰذا لازم ہے کہ بندہ اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کر کے مضبوط ارادے اور پکے عزم کے ساتھ دین پر چلنا شروع کر دے۔

(۳) دین سے جڑے رہنا

جب انسان کوئی عمل مستقل کرتا ہے تو پھر وہ اس کی عادت بن جاتا ہے اور اس کے کرنے میں اُس کو سہولت اور آسانی ہوتی ہے۔ شیطان کوشش کرتا ہے کہ بندہ کو نیک کام سے روکے اور گناہ کے کام میں مبتلا کر دے۔ اس لیے آدمی جب اپنی زندگی بدل کر کوئی نیک کام یا شریعت کے حکم پر عمل شروع کرے تو پھر اُس کو ایک دن کے لیے بھی نہ چھوڑے بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ اس پر عمل کرے۔ اسی طرح جب ایک دفعہ کسی گناہ کو چھوڑنے کا عزم کرے تو پھر اس کا تصور بھی ذہن میں نہ لائے۔ ہر وقت ایک ہی فکر ذہن میں موجود رکھے کہ میں کس طرح گناہوں سے بچ کر نیک اعمال کرنے والا بن جاؤں اور اپنی پوری زندگی کس طرح شریعت کے موافق بناؤں۔ اس کے لیے لازم ہے کہ آدمی ایک لمحہ بھی دین اور قرآن وسنت کے احکامات سے غافل ہو کر نہ گزارے، بلکہ ہر وقت دین سے جڑا اور متعلق رہے۔

(۴) کسی نیک آدمی یا عالم سے مستقل تعلق

دین سے جڑے رہنے، شریعت کا علم حاصل کرنے، گناہوں سے بچنے اور اپنی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک عام مسلمان ضرور کسی عالم یا دیندار شخص کی نگرانی میں ہو، تاکہ وہ ہر وقت اس پر نظر رکھے اور حسب ضرورت اصلاح و رہنمائی کرے۔ لہٰذا ہر آدمی کسی با اعتماد اور نیک عالم دین کے ساتھ مستقل بنیادوں پر اپنا رابطہ قائم کرکے اپنے آپ کو اُس کی نگرانی میں دیدے، وقتاً فوقتاً اُس سے رابطے میں رہے، اپنی حالت سے اُس کو آگاہ رکھے، اپنے ہر عمل کے جائز و ناجائز ہونے کے بارے میں اُس سے پوچھے، اُس کے ذریعے اپنے نفس کا علاج کرے اور زندگی کے تمام امور میں اُس کی ہدایات پر عمل کرے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ آدمی کو دین سے متعلق جائز و ناجائز، حرام و حلال اور گناہ و ثواب کے بارے میں ہر وقت آگاہی حاصل ہوگی اور دوسرا اہم فائدہ یہ ہوگا کہ دیندار اور عالم کے ساتھ اس ربط اور تعلق کی وجہ سے یہ آدمی کنٹرول میں ہوگا اور دوبارہ نفس اور شیطان کے قابو میں نہیں آئے گا، کیونکہ اُس کے دل میں ہر وقت یہ خیال ہوگا کہ مجھے اس دیندار شخص اور عالم سے ملاقات کرکے جواب اور اپنی روزمرہ زندگی کا حساب دینا ہے۔ اس کی حیثیت ایسی ہوگی جیسے کسی سکول اور مدرسے میں بچے بہت سارے غلط کام اپنے اساتذہ کے ڈر کی وجہ سے نہیں کرتے، تو اس نیک و دیندار شخص کی مثال ایک استاد کی ہوگی جو ہر وقت اپنے شاگرد کی پوری زندگی پر نظر رکھے گا۔

(۵) دینی محافل میں شرکت

ہمارا عام زندگی میں بھی یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جب کوئی کسی کام سے کچھ عرصہ کے لیے دور رہ جاتا ہے تو نہ صرف اُس کام سے توجہ ہٹ جاتی ہے بلکہ وہ کام اور عمل بھول بھی

جاتا ہے۔ جب کوئی طالب العلم چند دن سکول اور مدرسہ نہیں جاتا تو پھر دوبارہ جانے کے لیے اس کا دل نہیں لگتا۔ اسی طرح کسی بھی دنیاوی کام میں آدمی کا دل اس وقت لگتا ہے اور توجہ اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب وہ مستقل اس کام سے وابستہ ہو۔ اس لیے دین سے وابستہ اور متعلق رہنے اور اپنی توجہ کو برقرار رکھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ آدمی نیک اور دیندار لوگوں کی مجالس میں شرکت کرے۔ جہاں بھی دین اور قرآن وحدیث کی نسبت سے کوئی محفل اور پروگرام ہو، اس میں ضرور حاضری دے، علماء کرام سے زیادہ سے زیادہ ملاقاتیں کرے، تبلیغی جماعت کے ساتھ سہ روزہ اور چلہ میں جائے، محلّہ کی مسجد میں ہونے والی تعلیم میں روزانہ بیٹھے، درس قرآن سننے کے لیے جائے اور اسلامی کتابیں پڑھنا اپنا معمول بنائے۔ اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس آدمی کی روح دینی اعتبار سے ہر وقت تازہ رہے گی، دل آمادہ ہوگا اور دین کی طرف میلان وتوجہ برقرار رہے گی۔ حضور ﷺ نے بھی ایسی مجالس میں شرکت کی ترغیب دی ہے۔ ایک روایت میں ہے: ''**قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اِذا مَرَرتُم بِرِیَاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوا، قِیلَ یا رَسولَ اللّٰه! وَ مَا رِیاضُ الْجَنّة؟ قَال: مَجَالِسُ الْعِلْم**'' ترجمہ: (حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم جنت کے باغوں پر گزرا کرو تو چرلیا کرو، پوچھا گیا، اے اللہ کے رسول! یہ جنت کے باغ کیا ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: علم کی مجالس)۔ ترمذی شریف کی روایت میں ''علم کی مجالس'' کی جگہ ''حِلَقُ الذِکر'' یعنی ذکر کے حلقے والے الفاظ بھی آئے ہیں۔ دونوں کا ایک ہی مطلب ہے کہ جب کہاں تمھیں دین اور علم کی نسبت سے کوئی مجلس ملے تو اُس میں ضرور شرکت کر کے کچھ سیکھنے اور نفع حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ روایت میں ہے کہ ''حضرت لقمان نے اپنی بیٹے سے کہا کہ اے میرے بیٹے! علماء کی مجلسوں سے جڑے رہو، حکیم (یعنی دانا) لوگوں کی گفتگو سنا کرو۔ اللہ تعالیٰ مردہ دل کو حکمت کی روشنی سے اس طرح زندہ (یعنی تازہ اور روشن) کرتا ہے جس طرح مردہ (یعنی بنجر) زمین کو بارش کے قطروں سے زندہ (یعنی تازہ) کرتا ہے''۔ اس سے معلوم ہوا

کہ نیکی کی مجلسوں میں شرکت سے آدمی کی روح اور دل کو تازگی ملتی ہے۔

(۶) نیک صحبت اختیار کرنا

آدمی کی زندگی پر ماحول، دوستوں اور جن کے ساتھ یہ اٹھتا بیٹھتا ہے اُن سب کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے کیونکہ انسان اپنے ماحول اور قریب رہنے والے افراد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر آدمی کے رابطے، اٹھنا بیٹھنا، گھوم پھرنا اور محفل وتعلق نیک لوگوں کے ساتھ ہو تو یہ آدمی یقیناً نیکی اور دین کی طرف مائل ہوگا اور اس کی زندگی پر نیکی کے اثرات ظاہر ہوں گے، جبکہ اس کے مقابلے میں اگر اس کا تعلق، گپ شپ، سیر وسیاحت اور نشست و برخاست بُرے، بے دین اور فاسق وفاجر لوگوں کے ساتھ ہو تو یہ آدمی بھی اُن کے اثرات اور تعلق کی وجہ سے خود بخود غلط راستے پر چلے گا اور دوستوں کی طرح یہ بھی گناہوں اور برائیوں میں مبتلا ہوگا۔ اس لیے قرآن وحدیث میں بھی دیندار لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور بے دین لوگوں سے دور رہنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

> ''نیک ساتھی اور برے ساتھی کی مثال عطر بیچنے والے عطار اور لوہار کی بھٹی کی سی ہے؛ مشک بیچنے والے کے پاس سے تم دو اچھائیوں میں سے ایک نہ ایک ضرور پالو گے؛ یا تو مشک خرید لو گے ورنہ کم از کم اس کی خوشبو تو ضرور ہی پالو گے، لیکن لوہار کی بھٹی یا تمہارے بدن اور کپڑوں کو جھلسا دے گی ورنہ بدبو تو اس سے تم ضرور پالو گے''۔ (صحیح بخاری)۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تم کسی نیک آدمی کی محفل میں جاؤ گے تو تم اس سے کوئی دینی مسئلہ پوچھ کر نفع حاصل کرو گے، اگر تم نہ پوچھو تو وہ از خود تمھیں دین کی باتیں بتائے گا، اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی اس کی نیکی کا اثر تم پر پڑے گا اور تم برائی سے محفوظ رہو گے۔ اس کے مقابلے میں اگر تم برے ساتھیوں اور فاسق وفاجر لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اختیار کرو گے تو وہ تمھیں بھی غلط

راستہ پر گامزن کریں گے، اگر یہ نہ ہوتو پھر بھی ان کی نحوست اور برائی کا اثر خود بخود تمھارے اوپر پڑے گا۔

نیک لوگوں کے قریب رہنا جہاں اس لحاظ سے فائدے کا باعث ہے کہ اس سے آدمی کے دینی علم وعمل میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اُس کا رجحان دین کی طرف رہتا ہے تو وہاں نیک و دیندار لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے میں بذات خود بھی اجر وثواب ہے۔ اسی طرح بدچلن اور دین سے بے خبر وغافل لوگوں کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے جہاں آدمی خود بدکردار اور دین سے غافل ہوجاتا ہے وہاں یہ عمل ناجائز اور گناہ بھی ہے۔ اس لیے دیندار اور متقی لوگوں کی محفلوں میں بیٹھنا چاہئے جبکہ بے دین، بدچلن اور فاسق وفاجر لوگوں سے ممکن حد تک اپنے آپ کو بچائے رکھنا چاہئے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ''اَلْمَرءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ'' (بخاری) کہ آدمی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن سے وہ محبت رکھتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ دنیا میں جن لوگوں کے ساتھ کسی کا اٹھنا بیٹھنا اور تعلق ہوتا ہے تو قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ اس کو انہی لوگوں کی صف میں اٹھائے گا۔ جب پہلے بتایا گیا کہ آدمی اپنے دوست اور ساتھیوں کے زیر اثر آتا ہے تو پھر ہر آدمی کو خود غور کرنا چاہئے کہ اس کا تعلق کس قسم کے لوگوں سے ہے۔ حضور ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

''اَلرَّجُلُ علی دینِ خَلیلہٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکم مَنْ یُّخالِلُ'' (ترمذی)

ترجمہ: (آدمی اپنے دوست کے دین (یعنی طریقے) پر ہوتا ہے، اس لیے تم میں سے ہر شخص (غور کرکے) دیکھے کہ وہ کس سے دوستی کررہا ہے)۔

دنیا کی دوستیاں جن پر ہم فخر کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر قربان ہوجاتے ہیں، یہ قیامت کے دن تباہی کی باعث ہوں گی۔ وہاں صرف ان لوگوں کا تعلق مفید ہوگا جن سے تعلق دینداری اور تقوی کی بنیاد پر ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (الزخرف: ۶۷) ترجمہ: ''اس (قیامت کے) دن تمام

دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، سوائے متقی لوگوں کے''۔ دنیا کی بے دینی اور گناہ کے کاموں میں تو یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن یہی دوستی قیامت کے دن خسارے کا باعث ہوگی اور یہ لوگ وہاں ایک دوسرے سے لڑیں گے کہ تیری وجہ سے میں آج نقصان میں پڑ گیا۔ ایک اور آیت میں ہے کہ ﴿وَ لَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْماً﴾ کہ وہاں کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کو پوچھے گا بھی نہیں۔ ان کے مقابلے میں نیک اور متقی لوگ جن کا تعلق یہاں دنیا میں دین کی نسبت سے ہوتا ہے، وہ قیامت میں بھی ایک ساتھ ہوں گے۔ جب قیامت کے دن حساب و کتاب کے دوران آدمی کو احساس ہوجائے کہ دنیا میں بری صحبت اور غلط و گنہگار لوگوں کے ساتھ تعلق و دوستی کا آج کتنا نقصان ہے تو یہ آدمی بڑی حسرت سے کہے گا کہ:

﴿یٰوَیْلَتیٰ لَیْتَنِی لَمْ اَتَّخِذْ فُلَاناً خَلِیْلاً﴾ (سورہ فرقان:۲۸) ''ہائے میری بربادی! کاش میں نے فلاں شخص کو (دنیا میں) دوست نہ بنایا ہوتا)۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اندر دیندار اور نیک لوگوں کے ساتھ بیٹھنے اور تعلق قائم کرنے جبکہ بے دین، اللہ تعالیٰ سے غافل اور دنیاداروں سے دور رہنے کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حکم دیا تھا کہ: ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَ لَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ، تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا، وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوَاہُ وَ کَانَ اَمْرُہٗ فُرُطاً﴾ (الکہف:۲۸) ترجمہ: ''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں کہ وہ اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور تیری آنکھیں دنیوی زندگی کی خوبصورتی کی تلاش میں ایسے لوگوں سے ہٹنے نہ پائیں۔ اور کسی ایسے شخص کا کہنا نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے، اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور جس کا معاملہ حد سے گذر گیا ہے''۔ اس آیت شریفہ کا واضح مطلب یہ ہے کہ جو گ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دین کے کاموں میں مشغول

رہتے ہیں تو اُن کے ساتھ بیٹھا جائے اور تعلق قائم رکھا جائے اور جو لوگ اپنی خواہشات کے مطابق دنیا کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ہر وقت گناہوں میں مصروف ہوتے ہیں، اُن سے بچا جائے۔ ایک حدیث شریف میں حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ: ''لا تُصَاحِبْ اِلّا مُؤمِناً وَ لَا یَأکُلْ طَعَامَکَ الّا تَقِیٌّ'' (ابوداؤد)۔ ترجمہ: (مومن کے سوا کسی کو ساتھی نہ بناؤ اور تمھارا کھانا پرہیزگار (اور دینداروں) کے علاوہ کوئی اور نہ کھائے)۔

خلاصہ یہ ہوا کہ دنیا میں اچھی اور بری صحبت اور تعلق کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے، لہٰذا ہر کسی کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ حتی الامکان برے لوگوں اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے گریز کرے اور زیادہ سے زیادہ وقت دیندار اور نیک لوگوں کے ساتھ گزارے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾ (توبہ:۱۱۹) ترجمہ: (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو)۔ یعنی اللہ سے ڈرنے اور تقوی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ سچوں، دینداروں اور نیک لوگوں کی صحبت اور تعلق میں رہا کرو۔

نئی نسل کی دین سے دوری

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری نئی نسل اور نوجوانوں کی اکثریت اپنے دین و مذہب سے بالکل بیگانہ ہوتی جارہی ہے۔ پہلے زمانہ میں پھر بھی دین کی طرف کچھ نہ کچھ رغبت تھی لیکن اب مال و دولت، عہدہ و منصب اور شہرت و برتری کے مقابلوں نے لوگوں کو دین کے معاملے میں بالکل اندھا اور بہرا بنادیا ہے۔ جب پوری توجہ اسی دنیاداری پر ہے تو لوگوں نے اپنی اولاد کو مکمل طور دنیا اور دنیا کے عہدوں اور نوکریوں کے پیچھے لگادیا ہے۔ ہر کسی کو یہ فکر ہے کہ اس کی اولاد دنیاوی لحاظ سے ''کامیاب'' بن جائے جس کے لیے یہ لوگ ''روشن مستقبل'' کا لفظ بھی

استعمال کرتے ہیں۔اس سلسلے میں بات یہاں تک پہنچی ہے کہ دینی تربیت اور دین کے حوالے سے اپنی اولاد کو علم دینے یا اُن کو عمل پر آمادہ کرنے کا کچھ بھی غم نہیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ آج کی نئی نسل اور نوجوان بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ دین اور مذہب سے بہت دور جارہا ہے۔دنیاوی اور عصری علوم اور اسی طرح دنیاوی کاروبار و معاملات کے متعلق اُن کو نہ صرف معلومات ہوتی ہیں بلکہ مہارت کی حد تک آگے جاتے ہیں لیکن دوسری طرف دین کے اعتبار سے ان کی معلومات اور عمل دونوں نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ان کے طرز و انداز، گفتگو اور سوچ وفکر سے عموماً یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہنوں میں اہمیت صرف اسی دنیا اور دنیاوی ترقی کی ہے اور آخرت کے بارے میں یہ بالکل غافل و بے خبر ہیں۔

آج کے نوجوانوں کو مختلف ممالک کے فلمی انڈسٹریز اور تمام اداکاروں کے نام معلوم ہوتے ہیں، ایک ایک فلم کو جانتے ہیں، سپورٹس کے میدان میں ہر کھلاڑی کے نام اور کارکردگی کا علم رکھتے ہیں، مختلف شہروں میں سینیما ہالز کے پتے جانتے ہیں، اسی طرح دنیاوی علوم اور جنرل نالج کے سلسلے میں بھی ان کے پاس معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے لیکن یہی مسلمان نوجوان اپنے دین و مذہب، انبیاء کرام، صحابہ، تابعین، اپنے مسلمان اسلاف و اکابر اور مسلم تاریخ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ان کو اپنے ملک کے نامور علماء کرام اور مدارس کے نام معلوم نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کو کسی شہر میں مسجد کا پتہ ہوتا ہے۔فلمیں دیکھنا اور اسی طرح اخبارات، رسائل، ناول، ڈائجسٹ، شعروشاعری اور دیگر کتابوں کا مطالعہ تو بڑے شوق سے کرتے ہیں لیکن قرآن، حدیث اور مذہبی کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ سکول و کالج میں سائنس اور آرٹس کی بڑی بڑی کتابیں یاد کرتے ہیں لیکن قرآن وحدیث کے بارے میں ایک لفظ سے بھی آشنا نہیں ہوتے۔الغرض دین کے حوالے سے چھوٹی سی چھوٹی بات کو بھی نہیں سمجھتے۔ صبح سے شام تک ان کا اٹھنا بیٹھنا اسی دنیا اور دنیاوی معلومات کے ساتھ ہوتا ہے۔دوسری طرف

انٹرنیٹ کے غلط استعمال اور بری صحبتوں نے ان میں مزید اخلاقی بگاڑ پیدا کر کے بے راہ روی کا شکار بنا دیا ہے۔ان چیزوں کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ہمارے لڑکے لڑکیوں کو غیر مسلموں کے انداز و اطوار، لباس اور کھانے پینے کے طریقے وغیرہ پسند ہوتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اسلامی طریقوں اور تہذیب کو معیوب سمجھتے ہیں۔ بے دینی کی فضا اتنی عام ہے کہ آج کل کی اکثر کتابوں، رسائل، اخبارات اور دیگر پرنٹ یا الیکٹرانک ذرائع ابلاغ میں دین سے متعلق باتیں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں، جبکہ ان کے مقابلے میں دنیا پرستی، عریانی و فحاشی اور لوگوں کو گناہ میں مبتلا کرنے والا مواد زیادہ ہوتا ہے۔اس نقصان کے سب سے بڑے ذمہ دار والدین ہیں جنہوں نے اپنے بچوں اور اولاد کی کامیابی کے لیے صرف دنیاوی روزگار کا ہی انتخاب کیا ہے، اور ان کی دینی تربیت کی کچھ بھی فکر نہیں کرتے۔کوئی والد یہ نہیں سوچتا کہ میرے بیٹے یا بیٹی کو دین کے بارے میں کتنا علم ہے! اس کا اخلاقی معیار کیا ہے! شریعت کے احکامات پر کتنا عمل کرتا ہے؟ کس قسم کے لوگوں کے ساتھ کس قسم کی محفلوں میں بیٹھتا ہے؟ کبھی نماز و تلاوت کا اہتمام کرتا ہے یا نہیں؟ حلال و حرام یا جائز و ناجائز کی تمیز ہے یا نہیں؟ دیندار اور نیک چلن بنایا نہیں؟ والدین کو یہ فکر ہے کہ جیسا بھی ہو میری اولاد زیادہ سے زیادہ دنیا اور دنیاوی روزگار و ملازمت میں ترقی کر کے پیسہ کمائے۔ ڈاکٹر بنے، انجینئر بنے، بزنس مین بنے، کسی دفتر میں ملازمت ملے، باہر ملک جائے یا کوئی اور بڑی ڈگری حاصل کر کے اعلیٰ منصب اور عہدے تک پہنچ جائے۔اسی کو یہ لوگ روشن اور کامیاب مستقبل کہتے ہیں۔اپنی اولاد کی دنیاوی کامیابی پر فخر کرتے وقت والدین ایک لمحہ کے لیے یہ نہیں سوچتے کہ ہم نے انہیں دنیاوی لحاظ سے اگرچہ کامیاب بنا دیا لیکن دوسری طرف ان کو دین اور اپنے مذہب سے کتنا دور رکھا۔کتنی بڑی بڑی ڈگریوں اور عہدوں والے ہوتے ہیں جن کو قرآن کی ایک چھوٹی سی سورت بھی یاد نہیں ہوتی اور درست انداز سے قرآن کا تلفظ بھی نہیں کر سکتے۔

یہ صرف جدید تعلیم یافتہ افراد کی بات نہیں بلکہ لوگوں اور بالخصوص نوجوانوں کا وہ طبقہ جو تعلیمی اداروں سے باہر مختلف جگہوں پر محنت مزدوری اور آمدنی کی تلاش میں مصروف ہوتا ہے اس کی بھی پوری توجہ پیسہ کمانے پر ہوتی ہے اور گھر سے والدین کو بھی یہی فکر ہوتی ہے کہ بیٹے نے کتنے پیسے کمائے!! یہاں بھی والدین کبھی دین کے بارے میں نہیں پوچھتے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا اور ہماری نئی نسل اپنے دین و مذہب سے یوں دور ہوتی گئی تو آئندہ اوقات میں دینی حوالے سے ہمارے گھروں اور معاشرے کی حالت بہت خراب ہوگی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہم اپنے بچوں کو دینی علم کے لیے مدارس میں بھیجیں اور ان کو عالم بنا دیں تو ان کا مستقبل نہیں بنے گا اور پھر وہ کہاں سے کھائیں گے؟ تو اس بات کے جواب میں چند باتیں عرض ہیں؛ پہلی بات یہ ہے کہ آج کون سا عالم ہے جو کھاتا نہیں یا سخت معاشی بحرانوں کا شکار ہے؟ الحمدللہ، علماء کرام اپنے محدود وسائل کے باوجود خوشی کی زندگی گزارتے ہیں اور اپنی زندگی سے اچھی طرح مطمئن ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں دنیادار ہر وقت مزید مال و دولت کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ مہنگائی اور وسائل کی قلت کی سب سے زیادہ فریاد یہی دنیادار اور پیسہ والے لوگ ہی کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ دینی تعلیم نے تو دنیاوی کاروبار یا ذرائع آمدن کی تلاش سے کبھی منع نہیں کیا ہے۔ بیشک ایک آدمی دینی علم حاصل کر کے نیک و دیندار بن جائے اور پھر کسی بھی شعبہ میں کاروبار اور ملازمت کر کے دنیاوی اسباب بھی تلاش کرے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مطلوب یہ نہیں ہے کہ کوئی ضرور کسی مدرسہ میں جا کر روایتی علم حاصل کر کے مستقل وہاں بیٹھ جائے، بلکہ حکم نیک اور دیندار بننے کا ہے۔ باقاعدہ مدرسہ جا کر وہاں روایتی علم حاصل نہ بھی کرے لیکن کسی کا بیٹا یا بیٹی جہاں بھی ہو اور جس بھی شعبہ میں ہو، اُس کو نیک اور پرہیزگار بنانے کا اہتمام کیا جائے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اصل معاملہ دنیا اور آخرت کے درمیان مقابلے اور اہمیت کا ہے؛ اگرچہ بظاہر دنیاوی کامیابی کے راستے تلاش کرنے میں آدمی کا فائدہ ہو اور نیک و متقی بننے میں دنیاوی اعتبار

سے نقصان ہو لیکن پہلے بھی کئی بار ذکر کیا گیا کہ ہمیں اپنی دنیا نہیں بلکہ آخرت بہتر اور کامیاب بنانی ہے، اس لیے دنیا کی قربانی دیکر آخرت کے سنوارنے کو ترجیح دی جائے گی اور اپنی اولاد کے لیے اس راستے کا انتخاب کیا جائے گا جس میں بیشک دنیا ہاتھ نہ آئے لیکن اُخروی زندگی میں کامیابی نصیب ہو۔

اسی ضمن میں قرآن کریم کی ایک آیت ہے: ﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ، نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ، اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْراً﴾ (الاسراء:۳۱) ترجمہ: ''اور اپنی اولاد کو مفلسی (یعنی غریبی) کے خوف سے نہ مار ڈالو، ہم روزی دیتے ہیں ان کو اور تم کو، بیشک اُن کو مارنا بڑی خطا ہے''۔ بعض کافر اور مشرکین لوگ اپنی اولاد کو اس خوف اور ڈر سے مار ڈالتے تھے کہ ان کی وجہ سے کھانے پینے کا بوجھ پڑے گا اور ہم غریب ہو جائیں گے۔ یہ بچے کہاں سے کھائیں گے اور ہمارے اوپر معاشی تنگی آئے گی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو منع کیا کہ غربت اور معاشی تنگی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، کیونکہ رزق دینے والا اللہ ہے۔ تو آج لوگ اپنی اولاد کو اس ڈر سے دین اور قرآن وحدیث کی تعلیم سے دور رکھ کر صرف دنیوی ترقی، کاروبار اور ملازمت میں ڈالتے ہیں کہ کل کو یہ معاشی لحاظ سے مستحکم ہو اور کسی تنگی کا شکار نہ ہو۔ اگرچہ یہ اولاد دین سے بالکل غافل اور بے عمل رہ جائے لیکن والدین کو صرف دنیا کی فکر ہوتی ہے۔ تو مذکورہ آیت کے مطابق اگر وہ کافر اور مشرکین اپنی اولاد کو معاشی تنگی کے خوف سے ظاہری اور جسمانی لحاظ سے قتل کرتے تھے تو آج لوگ اپنی اولاد کو اسی ڈر کے باعث دین اور مذہب سے دور رکھ کر روحانی لحاظ سے قتل کرتے ہیں۔

فکری اور نظریاتی گمراہی

آج کے جدید تعلیم یافتہ لوگ اور بالخصوص نوجوان نسل کئی حوالوں سے فتنوں کی لپیٹ میں ہے۔ عملی اور اخلاقی بگاڑ کا تو ہمارا معاشرہ پہلے سے ہی شکار تھا لیکن اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم، سائنسی ترقی، دنیا کے باہم مربوط ہونے، مختلف عالمی انقلابات، سوشل میڈیا کے استعمال اور جدید دور کے نئے نئے نظریات نے فکری لحاظ سے مسلمان نوجوانوں اور بالخصوص تعلیم یافتہ طبقے کو بُری طرح متاثر کیا ہے۔ سیکولرزم، ماڈرنزم، لبرلزم اور الحاد جیسے نظریات اور نعروں نے ہمارے معاشرے میں بھی جڑیں ڈالنا شروع کر دی ہیں، جن سے متاثر ہو کر ہمارا نوجوان اس طرف جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ علماء کرام اور دینی طبقے کو یہ فکر تھی کہ لوگ کس طرح نیک، پرہیزگار، متقی اور قرآن وسنت کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں! کیسے نمازی اور تلاوت کرنے والے بنیں! چہرے پر داڑھی سجائیں اور شلوار ٹخنوں سے اوپر کریں! اور اب بات اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ دیندار طبقہ کو یہ غم پیدا ہو گیا ہے کہ گمراہی کے شکار یہ لوگ پرہیزگار اور متقی نہ بنیں لیکن کم از کم مسلمان تو رہیں اور فکری ونظریاتی گمراہی سے بچ جائیں۔ بچپن سے دینی ماحول نہ پانے، مذہبی تربیت نہ ہونے اور قرآن وسنت اور شریعت سے غافل رہنے کے باعث تعلیم یافتہ طبقہ بہت جلد اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ آج دور میں بہت تفصیل طلب موضوع ہے لیکن یہاں اس موضوع کی باریکات، مختلف نظریات کی تعریفات اور اقسام ومباحث کے بجائے سادہ انداز میں عوام کے لیے چند باتیں عرض کی جاتی ہیں:

(۱) مادہ پرستی اور دین سے دوری کا ایک نتیجہ یہ نکل آیا کہ آج نئی نسل اور نوجوانوں کے ذہنوں میں اپنے دین ومذہب اور مذہبی شعائر کی کوئی قدر وعزت باقی نہ رہی۔ ان کے ذہنوں میں نہ دین کی کوئی وقعت ہے اور نہ دینی احکامات پر عمل کوئی لازمی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہبی معاملات کو

مذاق سمجھتے ہوئے بالکل ہلکا لے رہے ہیں۔ان کو اس بات کی کوئی پروانہیں کہ اسلام اور مسلمان ترقی میں ہیں یا زوال کی طرف جارہے ہیں۔کہیں اسلام، اسلامی عقائد واحکامات اور مسلمان کو بحیثیت مسلمان کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے تو اس لبرل طبقہ کو کچھ بھی پروانہیں ہوتی، اور نہ ان کے دلوں میں کوئی درد محسوس ہوتا ہے۔

(۲) جدید سائنسی علوم کی ترقی اور ہر مادی چیز میں عقل، مشاہدہ اور تجربہ کو بنیاد بنانے کے باعث ماڈرن اور لبرل طبقہ اس گمراہی کا شکار ہے کہ وہ دین، مذہبی عقائد، اور قرآن وسنت کے احکامات کو بھی عقل اور سائنسی اصولوں کی بنیاد پر دیکھ کر جائزہ لیتے ہیں۔ ہر وہ شرعی حکم، عقیدہ یا عمل جو عقل میں نہ آئے یا سائنسی اصولوں کے مطابق نہ ہو تو الحاد کا شکار یہ طبقہ ان چیزوں سے انکار کرتا ہے۔جیسے: قبر کی زندگی، جنات، فرشتے، پل صراط، میزان، واقعہ معراج، انبیاء کرام کے معجزات، اولیاء کے کرامات، دعا کے اثرات وغیرہ کتنی ایسی چیزیں ہیں جن سے یہ لوگ انکار کرتے ہیں یا شک کا اظہار کرتے ہیں۔

(۳) الحاد، لادینیت اور سیکولر نظریات کے عام ہوجانے کی وجہ سے مسلمان کہلانے والے ایک طبقے کے لوگ محض کلمہ پڑھ کر ظاہری طور اپنے آپ کو مسلمان باور کراتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ دل سے اسلام اور اسلامی عقائد کو بالکل نہیں مانتے اور نہ ان کے نزدیک دین پر عمل کرنے کی کوئی اہمیت ہے۔ وہ دنیاوی زندگی میں اپنے آپ کو دینی حدود اور پابندیوں سے بالکل آزاد سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کے کسی بھی شعبے میں مذہبی احکامات کو دخل نہیں دیتے۔ان کے خیال میں انسان آزاد اور اپنی مرضی کا مالک ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ ان کے خیال میں بس یہی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہے۔

(۴) دین سے دوری اور گمراہی کے باعث جب ان لوگوں کے دلوں میں مذہب کی اہمیت باقی نہیں رہی تو اُس کے ساتھ لازمی طور پر علماء کرام، مذہب سے وابستہ افراد، مساجد، مدارس، دینی

سرگرمیوں اور دین سے متعلق دیگر امور کو یہ لوگ بڑی حقیر نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ ان کے دلوں میں بہت نفرت موجود ہوتی ہے۔فکری لحاظ سے یہ گمراہ طبقہ علماء کرام اور دینی طبقہ کو برا بھلا کہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کوئی نہ کوئی موقع اور واقعہ تلاش کر کے کسی نہ کسی طرح دینی لوگوں کو بدنام کیا جائے۔

(۵) ایک فتنہ اور نعرہ ''انسانیت'' کی شکل میں سامنے آرہا ہے۔کہ ''انسانیت'' ہی سب کچھ ہے۔ یہ لفظ تو بظاہر بڑا پرکشش اور ٹھیک نظر آتا ہے لیکن اس کی آڑ میں مسلمان اور غیر مسلم اور اسی طرح دین اسلام اور دیگر باطل مذاہب کے درمیان تمیز اور فرق کو ختم کیا جارہا ہے۔اس طبقے کا نعرہ ہے کہ کسی کو مسلمان و کافر، نیک و بد اور دیندار و بے دین کی نظر سے نہ دیکھو بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے دیکھو۔ یہ بات تو بظاہر لوگوں کو اچھی لگتی ہے لیکن اگر اس کی تفصیل میں جا کر دیکھا جائے تو یہ انتہائی خطرناک اور دینِ اسلام کی تعلیمات اور اصولوں کی سراسر خلاف ہے۔

بہرحال یہ تو بطور مثال چند باتیں ہوگئیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فکری ونظریاتی گمراہی کے شکار اس طبقے میں ایسے افراد شامل ہیں جو حدیث سے منکر ہیں، قرآنی آیات سے انکار کرتے ہیں بلکہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، موت کے بعد والی زندگی کو نہیں مانتے اور فکری گمراہی کے بعد وہ ہر قسم کی عملی اور اخلاقی بدعملی میں مبتلا رہتے ہیں۔ایک ہے کسی دینی حکم پر عمل نہ کرنا اور ایک ہے دین یا دینی حکم سے انکار کرنا یا اس کا مذاق اڑا کر استہزاء کرنا۔تو عمل نہ کرنے سے آدمی گنہگار تو ہوجاتا ہے لیکن کافر یا گمراہ نہیں ہوتا، دوسری طرف دینی حکم سے انکار اور یا اس کا مذاق اڑانے سے آدمی کافر ہوجاتا ہے۔مثلاً کوئی نماز نہ پڑھے یا روزہ نہ رکھے تو وہ گنہگار تو ہوا، البتہ کافر یا گمراہ نہیں ہوا۔لیکن اگر کوئی نماز یا روزہ کو مانتا نہیں، اس کو اہمیت نہیں دیتا اور یا اس کو حقیر نظر سے دیکھتا ہے تو وہ کافر اور گمراہ ہوجاتا ہے۔

والدین کی ذمہ داری

بچوں کو نیک اور دیندار بنانے کی ابتداء بالکل بچپن سے ہوتی ہے جب یہ بچہ ابھی ماں کی گود میں ہوتا ہے۔ وہی سے والدین کو سوچنا اور غور کرنا چاہئے کہ کس انداز سے اس بچے کی تربیت و پرورش کر کے اس کو بڑا کرنا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''**کُلُّ مَوْلُودٍ یُولَدُ عَلَی الفِطرَةِ وَلٰکِن اَبَواهُ یُهَوِّدَانِه اَو یُنَصِّرَانِه اَو یُمَجِّسَانِه**''۔ (ہر بچہ کی پیدائش (دین کی) فطرت پر ہوتی ہے لیکن پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی، عیسائی اور یا مجوسی بنا دیتے ہیں) (بخاری)۔ ایک اور حدیث ہے کہ ''والدین اپنی اولاد کو جو بہترین تحفہ دیتے ہیں وہ اُن کی اچھی تربیت ہے'' (ترمذی) اس سے معلوم ہوا کہ یہ چھوٹا بچہ جس گھرانے اور ماحول میں پرورش پا کر بڑا ہو جاتا ہے، اُسی گھر، والدین اور ماحول کا اثر ضرور اس پر ہوگا۔ اگر والدین نے بچپن سے ہی اس بچے کو دین اور نیکی کے راستے پر لگا دیا تو یہ لڑکا ضرور دیندار بنے گا اور اگر والدین نے غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کر کے اس بچے کی نگرانی اور درست تربیت نہ کی اور اس کو دین و مذہب سے واقف بنانے کا اہتمام نہ کیا تو یہ بچہ بڑا ہو کر دین سے دور اور غافل ہی رہے گا۔ لہٰذا اس سلسلے میں والدین چند امور کا خیال ضرور رکھیں:

(۱) جب یہ بچہ ابھی بالکل چھوٹا اور ماں کی گود میں ہوتا ہے، اُسی وقت سے اس کے سامنے دین کی باتیں کی جائیں۔ اس کے کانوں میں کلمے، اللہ تعالیٰ کے نام وغیرہ ڈالے جائیں۔ جب وہ باتیں شروع کرنے لگتا ہے تو اس کو فضول گوئی اور ہنسی مذاق میں ڈالنے کے بجائے دین کی باتوں کا عادی بنایا جائے کہ اس کی باتوں کی ابتدا ہی دین، قرآن اور پیارے جملوں اور کلمات سے ہو جائے۔

(۲) بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی صلحاء اور نیک لوگوں والا لباس پہنایا جائے۔

(۳) بچپن سے بچوں کے دماغ میں جو باتیں بیٹھ جاتی ہیں یا اُن کی آنکھوں کے سامنے جو مناظر آجاتے ہیں وہی کچھ کا اثر پوری زندگی ان کے طرز و انداز اور طبیعت پر ہوتا ہے۔ لہٰذا بچوں کو ابتدا ہی سے اپنے ساتھ دینی مجالس میں لے جایا جائے، نیک لوگوں سے ملوایا جائے اور ان کے سامنے دین اور نیکی کی باتیں کی جائیں۔

(۴) ان بچوں کو حتی الامکان گلی کوچوں میں جانے اور دیگر بچوں کے ساتھ کھیل کود سے منع کیا جائے تاکہ ان پر بُرا اثر نہ پڑے اور انہیں غلط کاموں اور فضولیات کی عادت نہ پڑ جائے۔

(۵) جب ذرا بڑے ہو جائیں تو اُن کو قریبی مسجد اور مدرسہ میں بھیج دیا جائے تاکہ ان کی تعلیم کا آغاز قاعدہ اور قرآن سے ہو، اور ساتھ ساتھ دینی ماحول سے بھی مانوس اور آشنا ہو جائیں۔

(۶) اس کے بعد ان کو اپنے مذہب کی بنیادی معلومات سکھلانے اور روزمرہ ضرورت کے دینی علم سے آگاہ کرنے کا انتظام کیا جائے۔

(۷) اگر یہ بچے عصری تعلیم کے لیے کسی سکول جاتے ہیں تو ان کے لیے مناسب ادارے کا انتخاب کیا جائے اور ساتھ دینی تربیت بھی جاری رکھی جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سکول و کالج کے ساتھ ساتھ کسی دینی مدرسے سے بھی وابستہ ہوں اور وہاں علماء کے زیرِ تربیت ہوں، اور اگر مدرسہ نہ ہو تو خارجی طور پر باہر اپنے گاؤں اور علاقہ میں ان بچوں کو کسی نیک آدمی کی نگرانی اور تربیت میں دیا جائے تاکہ وہ ان پر نظر رکھ کر دینی حوالے سے ان کا خیال رکھے۔

(۸) اپنے بچوں پر روزانہ کی بنیاد پر صبح و شام ہر وقت نظر رکھی جائے کہ وہ کہاں جاتے ہیں؟ کس قسم کی محفل میں بیٹھتے ہیں؟ کن لوگوں سے ملنا جلنا ہوتا ہے؟ ان کے دوست اور ساتھی کون ہیں؟ گھر کس وقت آتے ہیں؟ وغیرہ

(۹) ان کو فضول مجالس، گپ شپ اور موسیقی وغیرہ کی محفلوں، کھیل کود کے میدانوں اور اس قسم کی دیگر بے فائدہ جگہوں سے دور رکھا جائے۔

(۱۰) ان کے سامنے ہر وقت اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ، قبر، آخرت، اور جنت و دوزخ کی باتیں کی جائیں، تاکہ یہ دین کی طرف متوجہ ہوں۔

(۱۱) ان کو ہر گناہ کے کام سے روکا جائے اور نیکی وثواب کے کاموں پر آمادہ کیا جائے۔

(۱۲) ان سے دنیاوی غلطی یا کوتاہی کے مقابلے میں دینی معاملات کے اندر غلطیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں زیادہ پوچھا جائے۔

(۱۳) ان کو سمجھایا جائے کہ بیشک دنیاوی تعلیم، عہدہ ومنصب وغیرہ حاصل کریں لیکن اصل نظر آخرت اور دین پر رکھیں۔

(۱۴) اگر بچوں میں سے کوئی بھی تعلیمی یا غیر تعلیمی سرگرمی وعمل جیسے محنت ومزدوری وغیرہ کے سلسلہ میں گھر سے باہر ہو، تو اس سے رابطے کے دوران سب سے پہلے دینی حالت کے بارے میں پوچھا جائے اور اس کو دین پر عمل جاری رکھنے کی ترغیب دی جائے، تاکہ وہ بچہ یہ سمجھے کہ میرے والدین کا مجھ سے اصل مطالبہ دنیا یا دنیاوی ترقی کا نہیں بلکہ دین اور آخرت کی بہتری کا ہے۔

یہ تو چند باتیں ہوگئیں؛ غرض یہ ہے کہ دنیاوی ترقی، محنت ومزدوری، ذرائع آمدن کی تلاش، جدید تعلیم، کھیتی باڑی، کسی جگہ نوکری اور منصب وعہدہ وغیرہ ہر مقام اور ہر حالت میں اپنے بچوں کو دین سے غافل نہ ہونے دیں، بلکہ ان کو نیک، صالح اور دیندار بنانے کی پوری کوشش کریں۔ اگر اس انداز سے بچوں کی تربیت کی جائے تو وہ جہاں بھی ہوں گے اور جس بھی عہدے اور کام کو سنبھالیں گے لیکن بے دینی، بے راہ روی اور گمراہی سے بچ کر نیک اور پرہیزگار ہوں گے۔ ہر بچہ تین جگہوں سے تربیت پاتا ہے؛ گھر، ماحول اور تعلیمی درسگاہ۔ تو ان تینوں جگہوں میں ان کو دین کے قالب کے اندر رکھا جائے تاکہ کہیں بھی بھٹک کر باہر نہ نکلے اور بے دینی کا شکار نہ ہوجائیں۔

مسلمانوں کے اجتماعی فرائض

گذشتہ عنوانات کے تحت جتنے مضامین پر بحث کی گئی، ان میں سے اکثر کا تعلق فرد کی ذاتی اور انفرادی زندگی سے ہے کہ آدمی کس طرح اپنے ظاہری عمل اور نفس کی اصلاح پر توجہ دے کر نیک اور دیندار بن جائے۔ جیسا کہ پہلے بھی ایک عنوان کے تحت ذکر ہوا تھا کہ اسلام ایک جامع اور مکمل دین ہے جو زندگی کے ہر ہر شعبے سے متعلق ہے، اور یہ بات بھی آئی تھی کہ دین کا بہت کم حصہ وہ ہے جو ایک فرد کی ذات تک محدود ہے اور اکثر حصے کا تعلق معاملات اور مسلمانوں کے اجتماعی زندگی سے ہے، اس لیے بحیثیت مسلمان جس طرح آدمی پر اپنی ذات کو شریعت کا تابع بنانا ضروری ہے، اسی طرح اللہ کے دین کو عام کرنے، دوسروں تک پہنچانے اور ہر جگہ اور ہر معاملہ میں اسلام ہی کو برتری دینے کا جو اجتماعی عمل ہے، اُس میں بھی ہر مسلمان پر اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لینا لازم ہے۔ یہ تو بہت تفصیل طلب موضوع ہے لیکن اختصار کی خاطر صرف توجہ دلانے کی غرض سے اس کو یہاں دو عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا ہے:

(۱) دعوتِ دین واشاعت دین

چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم فرمایا ہے، جس کے بعد احکاماتِ الٰہی کی تبلیغ اور تنفیذ کے لیے کوئی دوسرا نبی آیا ہے اور نہ آئے گا۔ اس لیے دین اسلام کو قیامت تک باقی رکھنے اور اس کی اشاعت وتبلیغ کی ذمہ داری اس امت پر ڈالی گئی ہے۔ اس آخری امت کے فضائل میں سے ایک فضیلت اس وجہ سے بھی ہے کہ اس پر اسلام کی اشاعت وحفاظت کی بہت بڑی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ ظاہر ہے ''امت'' افراد سے بنتی ہے اور یہی افراد اجتماعی عمل کے ذریعے دین کی تبلیغ اور دعوت میں حصہ لیں گے۔ اسی سلسلے میں قرآن کریم کی یہ آیت موجود ہے کہ: ﴿كُنتُم خَيرَ اُمةٍ اُخرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوفِ

وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ﴾ ترجمہ (مسلمانو! تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے (اور اصلاح) کے لیے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔ (آل عمران: ۱۱۰) ۔ تو اس امت کے افراد کا وظیفہ اور فرض یہ ہے کہ وہ خود دین کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر لوگوں کو بھی دین پر لانے کی کوشش کریں گے، اسلام میں جن کاموں کے کرنے کا حکم ہے (یعنی نیکی کے کام) تو دیگر لوگوں کو اُن کی تلقین و نصیحت کریں گے اور جن بدی کے کاموں سے روکا گیا ہے، ان سے دیگر لوگوں کو بھی منع کریں گے، اسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں کام ہر مسلمان پر اس کی اپنی اپنی علمی، معاشرتی، سماجی اور منصبی حیثیت کے مطابق لازم ہوتے ہیں۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''تم میں سے جو شخص گناہ (اور بدی کا کام) دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل (یعنی روک) دے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان (کی نصیحت) سے اس کو روک دے، اگر اس کی (بھی) طاقت نہ ہو تو اپنے دل سے (اس کو برا سمجھے)، اور یہ سب سے کمزور (درجے کا) ایمان ہے''۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ''بَلِّغُوا عَنِّی وَ لَوْ اٰیة'' کہ میری طرف سے لوگوں کو پہنچا دو، اگرچہ ایک آیت ہی ہو۔ (ترمذی)۔ اسی طرح حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر فرمایا کہ میں نے تم تک دین پہنچا دیا اور پھر ارشاد فرمایا کہ: فَلْيُبَلِّغُ الشَّاهِدُ الْغَآئِبَ : کہ یہاں حاضر لوگ اس دین کو غائب لوگوں تک پہنچا دیں۔ اُسی وقت سے یہ سلسلہ شروع ہوا کہ آدمی کے پاس دین کا جتنا علم ہے وہ اس کو دوسروں تک پہنچائے گا اور یوں یہ انداز قیامت تک جاری رہے گا۔ آج الحمدللہ مسلمانوں کا ایک طبقہ مدارس، تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ کے مختلف طریقوں وغیرہ کی شکل میں یہ فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ درحقیقت یہ چند افراد کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس میں حصہ لیں اور اجتماعی بنیادوں پر بھی دین کی بقا، حفاظت

اور تبلیغ واشاعت کے لیے طریقہ کار وضع کریں۔ سورہ عصر کی ایک آیت کے حوالے سے یہ بات پہلے گذر گئی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کامیاب اور خسارے سے بچے ہوئے لوگوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ دوسروں کو حق اور نیکی کی باتوں کی تلقین وتبلیغ کریں گے۔ اسی طرح ایک اور آیت میں بھی تاکیداً کہا گیا ہے کہ ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (اور تمھارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ (سورہ آل عمران: ۱۰۴)۔ مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ برائی دیکھ کر خاموش نہیں رہے گا بلکہ اس کو منع کرنے کے لیے فکرمند ہوگا۔ اسی طرح وہ نیکی اور بھلائی کی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے بھی اہتمام وانتظام میں حصہ لے گا۔ حضور ﷺ کے زمانہ سے لیکر آج تک دین ہمیں اسی انداز میں پہنچا ہے اور آج کے بعد قیامت تک نسل در نسل اسی طرح دین کی حفاظت اور بقا جاری رہے گی۔ دعوتِ دین کے سلسلے میں ایک دعوت غیر مسلموں کو ہے کہ ان کو دین اسلام کی حقانیت اور سچائی سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ اپنے باطل ادیان سے رجوع کرکے اسلام میں داخل ہوجائیں۔ یہ امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے اور بالخصوص ان افراد پر یہ ذمہ داری اور زیادہ عائد ہوتی ہے جو کسی بھی طرح غیر مسلموں تک ان کی رسائی ہوسکتی ہے۔ پوری دنیا میں دین اسلام کو عام کرنے کے لیے جو طریقے ہیں، ان میں ایک یہی دعوت کا طریقہ ہے کہ ہر ہر ملک اور ہر ہر غیر مسلم تک یہ دعوت پہنچ جائے تاکہ ان کے سامنے دین اسلام کا نقشہ اور حقیقت آجائے۔ دوسری دعوت مسلم معاشرے کے اندر ہے کہ دین سے غافل اور بے خبر مسلمانوں کو قرآن وحدیث اور شریعت کے تقاضوں سے آگاہ کرنے کے لیے ان کے سامنے دین ومذہب کی اصل روح پیش کی جائے تاکہ وہ بے دینی سے نکل کر پورے اسلام میں داخل ہوجائیں۔ پھر اس دعوتِ دین کے لیے کوئی مخصوص طریقہ

فرض نہیں بلکہ ہر علاقے اور شخص کے اعتبار سے مختلف طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔کوئی شخص انفرادی طور پر بھی یہ فریضہ سرانجام دے سکتا ہے لیکن وفود اور اجتماعی انداز میں جب دین کی اشاعت وتبلیغ کے لیے کوئی منظّم انتظام ہوتا ہے تو وہ زیادہ مفید وموثر ثابت ہوتا ہے۔

(۲) اسلامی معاشرہ کی تشکیل

جاری عنوان کی تمہید میں یہ بات آ گئی کہ دین کے اکثر احکامات کا تعلق لوگوں کے اجتماعی معاملات سے ہے۔اب اجتماعی زندگی کی حیثیت سے صرف یہ بات کافی نہیں ہوسکتی کہ ہر ہر آدمی صرف شعبہ عبادات میں مشغول رہ کر محض اپنے ذاتی اعمال درست کرلے بلکہ ضروری ہے کہ مسلمان ایک ایسا اسلامی معاشرہ تشکیل دیں جہاں عبادات، معاملات، سیاسیات، اخلاق اور جملہ امور میں دین ومذہب اور قرآن وسنت کا رنگ غالب ہو اور اسلام کے علاوہ کسی دوسرے قانون، رسم، رواج اور نظریہ کی کوئی ملاوٹ یا اثر نہ ہو۔معاشرہ صرف کسی گاؤں یا محلے میں رہنے والے لوگوں کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ جہاں جہاں مسلمان اجتماعی انداز میں بستے ہیں اور جس جس حیثیت وانداز سے زندگی گزارتے ہیں، وہ ان کے لیے معاشرہ ہے۔اس لحاظ سے ایک مسلمان کہلانے والا ملک معاشرہ ہے، اور پھر اس سے نیچے ایک گاؤں اور محلے تک مختلف سطح کے معاشرے ہوتے ہیں، جہاں مسلمان باہم زندگی گزارتے ہوئے ایک دوسرے سے منسلک رہتے ہیں اور مختلف امور میں ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ساتھ ساتھ ریاستی اور حکومتی بنیادوں پر لوگوں کے مسائل کے حل اور ان کے درمیان پیش آنے والے تنازعات، سانحات اور رسوم ورواجات کے لیے قوانین وطریقے بنائے جاتے ہیں۔تو مسلمان اور بالخصوص صاحب حیثیت وطاقت لوگوں پر لازم ہے کہ وہ ایسے معاشرے کی تشکیل کریں جہاں صرف نام کی حد تک مسلمان نہ رہتے ہوں بلکہ ہر مقام پر بلحاظ قانون اور طریقہ اسلام ہی غالب نظر آئے۔جیسے قرآن کریم کی آیت ہے کہ ﴿هُوَ الَّذِی اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (توبہ:۳۳) ترجمہ: وہ اللہ ہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تا کہ اس (دین) کو دیگر تمام دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرک لوگوں کو یہ بات کتنی ناپسند ہو:۔ یہ بڑی جامع آیت ہے اور علماء کرام و مفسرین نے اس کی تشریح مختلف لحاظوں سے کردی ہے۔ دلیل وحجت اور حقانیت کے لحاظ سے تو ظاہر ہے دین اسلام تمام دیگر ادیان پر غالب و برتر ہی ہے، وغیرہ، لیکن یہاں زیرِنظر موضوع کے اعتبار سے اگر غور کیا جائے تو دین اسلام کو دیگر ادیان پر غالب کرنے اور اس کو ہر لحاظ سے برتر بنانے کا یہ مطلب بھی ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی، سماجی، سیاسی اور انفرادی زندگی میں تمام قوانین، اصول وضوابط اور رسوم و رواجات اسلام کے مطابق ہوں گے اور ہر معاملہ میں دین اسلام ہی کو فوقیت حاصل ہوگی۔ گھریلو امور، شادی غمی، عوامی وسماجی روابط، باہمی تعاون، عدالتی نظام، تنازعات کا حل، سیاسی طریق کار، پارلیمنٹ، کچہری، نظام تعلیم، معیشت، صنعت، زراعت، تجارت، بینکنگ اور دفتری ضوابط وغیرہ تمام کے تمام امور میں اسلام اور شریعت کا واضح رنگ نظر آئے گا۔ ان تمام جگہوں میں ذاتی خواہشات، آباؤ اجداد کی چھوڑی ہوئی غلط رسوم، غیر مسلم اقوام کے طریقوں اور دیگر باطل اور غیر شرعی قوانین کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ تب جا کر یہ حقیقی معنوں میں اسلامی ریاست یا اسلامی معاشرہ کہلائے گا، اور اسی انداز میں مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری بھی پوری ہوگی۔

کئی بار پہلے بھی وضاحت آ گئی کہ اسلام صرف نماز، روزہ اور چند انفرادی اعمال کا نام نہیں بلکہ ہر ہر جگہ قرآن وسنت اور شرعی احکامات کی پیروی کرنے سے ہی پورے اسلام پر عمل ہوسکتا ہے۔ آج بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ مسلمان لوگ اسلام کو شعبہ عبادات کی حد تک تو مانتے ہیں اور کچھ عمل بھی کرتے ہیں لیکن اسلام کو بطور قانون اور نظام کے ماننے اور اپنے ملک ومعاشرہ میں نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں، بلکہ اس کے مقابلے میں غیر مسلموں کے طور طریقوں اور قوانین کو

ترجیح دی جاتی ہے۔ چند چیزوں کے علاوہ ہر معاملے میں اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق زندگی گزاردی جاتی ہے اور معاشرتی زندگی کے لیے اپنے اپنے مفاد کے تحت قوانین بنائے جاتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی بھی موقع پر اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اور قانون مقبول نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ﴿وَ مَن یَّبتَغِ غَیرَ الاِسلَامِ دِیناً فَلَنْ یُّقبَلَ مِنْہُ وَ ھُوَ فِی الْآخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْن﴾ (جو کوئی شخص اسلام کے سوا کسی اور دین (یعنی قانون) کو اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ان لوگوں میں شامل ہوگا جو سخت نقصان اٹھانے والے ہیں)۔ اس آیت کے تحت جہاں بلحاظ مذہب کسی سے اسلام کے علاوہ کوئی اور دین جیسے یہودیت، نصرانیت یا کوئی دوسرا دنیاوی مذہب قبول و منظور نہیں اسی طرح مسلمان ہوتے ہوئے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کسی دوسرے مذہب یا رسوم و رواجات اور ناجائز طریقوں کو شامل کرنا بھی درست نہیں۔ تو ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل مسلمانوں کا اجتماعی فرض ہے جہاں حکم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ہوگا اور پورے معاشرے کے ہر ہر عمل، انتظام اور نظام میں صرف اسلام ہی کا بول بالا ہوگا۔

فتنے اور علامات قیامت

حضور ﷺ کی احادیث مبارکہ میں آخری زمانہ سے متعلق مختلف قسم کے فتنوں اور علاماتِ قیامت کا ذکر موجود ہے، جن میں سے اکثر کا تعلق مادہ پرستی، دنیا پرستی، دین سے دوری اور گناہوں کی کثرت سے ہے۔ مذکورہ احادیث پر غور کرنے سے بالکل صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے جو کچھ فرمایا تھا وہی سب کچھ ایک ایک کر کے آج ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ احادیث میں ذکر شدہ فتنوں اور علامات میں سے اکثر کا ظہور ہو چکا ہے۔ قیامت کی جتنی چھوٹی علامات ہیں وہ تقریباً تمام آج موجود ہیں، اس لیے توجہ دلانے اور اپنے اعمال پر غور و فکر کرنے کے لیے ذیل میں چند وہ احادیث درج کی جاتی ہیں جن میں فتنوں اور علامات قیامت کا ذکر ہو گیا ہے:

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! دنیا ختم نہیں ہوگی یہاں تک کہ لوگوں پر ایسا دن بھی آئے گا کہ قاتل کو معلوم نہیں ہوگا کہ اس نے کس وجہ سے قتل کیا اور مقتول کو معلوم نہیں ہوگا کہ اسے کس وجہ سے قتل کیا گیا''۔ (مسلم)

☆ حضور ﷺ نے فرمایا: ''زمانہ قریب ہوتا جائے گا، علم ختم کر دیا جائے گا، فتنے ظاہر ہوں گے، دلوں میں بخل ڈال دیا جائے گا، اور ''ہرج'' زیادہ ہوجائے گا۔ انہوں (صحابہ) نے پوچھا: ہرج کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: قتل''۔ (بخاری ومسلم)

☆ حضور ﷺ نے فرمایا: ''قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ زمانہ قریب (یعنی مختصر) ہوجائے گا؛ تو سال مہینے کی طرح ہوگا، مہینہ جمعہ (یعنی ہفتے) کی طرح ہوگا، ہفتہ دن کی طرح ہوگا، دن ایک ساعت (گھنٹہ) کی طرح ہوگا اور گھنٹہ آگ کے شعلے کی طرح ہوگا۔ (ترمذی)

☆ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''جب مالِ غنیمت کو دولت، امانت کو مالِ غنیمت اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے، علم دینی مقاصد کے علاوہ (دنیوی مقاصد) کے لیے حاصل کیا جائے، آدمی اپنی بیوی کی اطاعت کرے اور والدین کی نافرمانی کرے، اپنے دوست کو قریب کرے اور والد کو دور رکھے، مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں، کسی (قوم) قبیلے کا سردار اُن میں سے فاسق (اور احمق) بن جائے، قوم میں سب سے زیادہ رذیل شخص اس قوم کا ذمہ دار اور منتظم ہوجائے، کسی آدمی کی عزت اس کے شر (اور برائی) سے بچنے کے لیے کی جائے، گانے والی عورتیں اور آلاتِ موسیقی عام ہوجائیں، شراب پی جائے اور اس امت کے بعد والے لوگ اپنے پہلے لوگوں پر لعن وطعن کریں تو اس وقت تم سرخ آندھیوں، زلزلوں، زمین میں دھنسنے، چہروں کے مسخ ہوجانے، آسمان سے پتھر برسنے اور دیگر نشانیوں کے اس طرح مسلسل آنے کا انتظار کرو جس طرح ہار کی ڈوری ٹوٹ جائے تو دانے لگاتار گرتے ہیں''۔ (ترمذی)

☆ ایک اعرابی آیا اور حضور ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کب ہوگی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب امانت ضائع کی جائے تو قیامت کا انتظار کر۔ اس نے پوچھا: امانت کے ضائع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب معاملہ (جیسے حکومت یا کسی اور کام) کی ذمہ داری نااہل کے حوالے کی جائے تو قیامت کا انتظار کر''۔ (بخاری)

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ''علامات

قیامت میں سے ہے کہ (دینی) علم اٹھ جائے گا، جہالت زیادہ ہوجائے گی، زنا کثرت سے ہوگا، شراب نوشی زیادہ ہوجائے گی، مرد کم ہوجائیں گے اور عورتیں زیادہ ہوجائیں گی، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کے لیے ایک منتظم ہوگا''۔ (بخاری ومسلم)

☆ایک حدیث میں علامات قیامت کے سلسلے میں یہ الفاظ ہیں: ''بکریوں میں موت کی وبا کی طرح انسانوں کی بکثرت اموات ہوں گی، وہ فتنہ جس کی لڑائی کی آگ ہر مسلمان کے گھر میں پہنچ جائے گی اور اس حد تک دولت کی کثرت ہوگی کہ اگر ایک آدمی کو ایک ہزار دینار دیے جائیں گے تو وہ انہیں کم سمجھ کر ناراضی کا اظہار کرے گا''۔ (مسند احمد)

☆حضورﷺ نے فرمایا: ''(علامات قیامت یہ ہیں کہ) لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے اور یہ کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن محتاج، بکریاں چرانے والوں کو دیکھو کہ وہ اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کررہے ہیں''۔ (مسلم)

☆ارشاد ہے: ''یہ قیامت کی نشانی ہے کہ لوگ مساجد (کی حد سے زیادہ زیب وزینت اور ظاہری خوبصورتی) میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔ (نسائی)

☆حضورﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اس کو اپنے بندوں سے چھین لے بلکہ وہ علماء کو موت دیکر علم کو اٹھائے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنائیں گے، ان سے سوالات کیے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے جواب دیں گے، اس لیے خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (صحیح بخاری)

☆رسول اللہﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں سے کچھ لوگ شراب پئیں گے، اور ان کے نام کچھ اور رکھیں گے، ان کے سروں پر باجے بجائے جائیں گے اور گانے والی عورتیں گائیں گی۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسادے گا اور ان میں بعض کو بندر اور سور بنادے گا۔ (ابن ماجہ)

☆ایک حدیث میں ہے کہ ''میری امت میں ایسے برے لوگ پیدا ہوجائیں گے جو زنا کاری، ریشم کا پہننا، شراب پینا اور گانے بجانے کو حلال بنالیں گے، اور کچھ متکبر قسم کے لوگ پہاڑ کی چوٹی پر چلے جائیں گے۔ چرواہے ان کی مویشی صبح وشام لائیں گے اور لے جائیں گے''۔

☆عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ''قیامت قریب آگئی؛ لوگ دنیا کے حرص میں زیادہ

ہوں گے اور اللہ تعالیٰ سے دور ہوں گے''۔

☆ حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ''قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ بدترین لوگ آگے جائیں گے (یعنی معاشرے میں ان کو عزت مل جائے گی)، اچھے لوگوں کو پیچھے کر دیا جائے گا (یعنی ان کی عزت نہیں ہوگی)، باتیں زیادہ ہوں گی اور عمل کم ہوگا۔ لوگوں میں مثناۃ پڑھی جائیں گی لیکن ان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا جو ان کا انکار کر سکے۔ پوچھا گیا کہ یہ ''مثناۃ'' کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل کی کتاب کے علاوہ جو کچھ بھی لکھوایا جائے''۔ (السلسلۃ الصحیحۃ)

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قریب ہے کہ دیگر (کافر) قومیں تم (مسلمانوں) پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں جیسے کھانے والے پیالوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تو ایک کہنے والے نے کہا: کیا ہم اس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم اس وقت بہت ہوں گے، لیکن تم سیلاب کی جھاگ کے مانند ہوں گے، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہارا خوف نکال دے گا، اور تمہارے دلوں میں ''وہن'' ڈال دے گا۔ تو ایک کہنے والے نے کہا: اللہ کے رسول! وہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دنیا کی محبت اور موت کا ڈر ہے''۔

☆ ایک حدیث میں ہے: ''قیامت سے پہلے سخت تاریک رات کی طرح فتنے ظاہر ہوں گے؛ جن میں آدمی صبح کو مومن ہوگا اور شام میں کافر ہو جائے گا، شام میں مومن ہوگا اور صبح کو کافر ہو جائے گا۔ دنیاوی ساز و سامان کے بدلے کچھ لوگ اپنا دین بیچ دیں گے''۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ ہمیں دین سیکھنے اور پورے اسلام میں داخل ہو کر عمل کرنے کی توفیق دے۔